پاکستان میں پہلی فوجی بغاوت

میجر جنرل (ریٹائرڈ) اکبر خان

جنرل اکبر خان پاکستانی فوج کے ان ڈرامائی کرداروں میں سے ہیں جنہوں نے اس برطانوی تربیت یافتہ ادارہ میں رہ کر اپنا قوم پرستی کا کردار خود وضع کیا اور ایک طرح سے اس ادارہ کے روایتی ڈسپلن کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی۔

قیام پاکستان کے ساتھ ہی کشمیر کے معاملہ نے جن چند افراد کو قوم پرستی کے گہرے جذبات سے سرشار کر کے فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے لئے ابھارا جنرل اکبر ایک طرح سے ان کے میر کارواں تھے اگر اس وقت کی سیاسی قیادت جنرل اکبر کا ساتھ دیتی تو یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آج کشمیر کے مسئلہ کی صورت مختلف ہوتی اور اس طرح پاکستان بھی اپنی جغرافیائی اہمیت کے اعتبار سے اس خطہ میں کچھ اور طرح کا کردار ادا کر رہا ہوتا۔

جیسا کہ بعد کے برسوں میں یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ ان دنوں کی فوجی قیادت نے قائداعظم محمد علی جناح کا جموں میں فوج بھیجنے کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا اگر پاکستانی فوج کا قائم مقام کمانڈر انچیف جنرل ڈگلس گریسی اس غداری کا ارتکاب نہ کرتا تو نہ صرف کشمیر اور پاکستان کے حوالہ سے پاکستان کی تاریخ مختلف صورت اختیار کر لیتی بلکہ پاکستانی فوج کی ابتدائی تشکیل کے خطوط بھی جداگانہ ہوتے۔

کیا راولپنڈی سازش کیس یا پاکستان کی پہلی فوجی بغاوت کا تعلق کلیتاً "جہاد کشمیر سے تھا یا اس کے ذریعے سے اس وقت کی فوجی قیادت اپنے آئندہ عزائم کے لئے فوج کو جنرل اکبر خان اور ان جیسے چند 'سرپھرے' لوگوں سے پاک کرنا چاہتی تھی'

پاکستان میں پہلی فوجی بغاوت

پاکستان میں پہلی فوجی بغاوت

میجر جنرل اکبر خان

ترجمہ
عاصم جمال

فرنٹیئر پوسٹ پبلیکیشنز

...اور مت پردہ پوشی کرو سچ کی جھوٹ سے' نہ چھپاؤ سچائی کو' جب تم جانتے ہو...

(القرآن)

اشاعت اول : 1993

تعداد : 1000

قیمت : =/100 روپے

تزئین : محمد الیاس

کمپوزنگ : احمد گرافکس' لاہور - فون: 320521

ناشر : رحمت شاہ آفریدی

فرنٹیر پوسٹ پبلیکیشنز

10- شاہراہ فاطمہ جناح' لاہور

فون: 6361382-85' 6360551

پرنٹر : میدان پرنٹرز

10- شاہراہ فاطمہ جناح' لاہور

فہرست

کچھ میجر جنرل اکبر خان کے بارے میں

اکبر خان ۲۴؍ دسمبر ۱۹۱۲ء کو ضلع پشاور کے ایک گاؤں اتمن زئی میں پیدا ہوئے۔ وہ محمد زئی پٹھانوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے والد اپنے علاقے کے بڑے زمیندار تھے۔ اکبر خان کے والد پرانی وضع کے بڑے جابر قسم کے جاگیردار تھے اور اکبر خان ہمیں سناتے ہیں کہ جب وہ کسی سے ناراض ہوتے تھے تو اسے درخت سے الٹا لٹکا دیتے تھے۔ یوں تو اکبر خان کے والد بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے لیکن ایک دفعہ کسی لفظ کے تلفظ پر ان کی ایک مولوی صاحب سے تکرار ہو گئی۔ بحث اتنی بڑھی کہ والد نے مولوی کو بھی درخت پر الٹا لٹکوا دیا اور تھوڑی دیر کے بعد مولوی صاحب نے اقرار کر لیا کہ تلفظ کے معاملے میں وہ (مولوی) غلطی پر تھے۔ یہ سخت گیری کسی حد تک جنرل اکبر خان نے بھی ورثے میں پائی لیکن انہوں نے بقول ان کے اپنے، اعتدال کی حد سے تجاوز نہیں کیا۔

۱۹۳۱ء میں جب اکبر خان اسلامیہ کالج پشاور میں پڑھ رہے تھے، انہیں فوج میں جانے کی سوجھی۔ یہ وہ دور تھا جب انڈین آرمی میں تقریباً تمام کمیشنڈ افسر انگریز ہوتے تھے اور دیسی لوگ صرف این سی او اور وی سی او کے عہدے تک محدود تھے۔ نئی پالیسی کے مطابق انگریزی حکومت نے فیصلہ کیا کہ ہر سال چند ہندوستانیوں کو بھی کمیشن کے لئے چن لیا جائے۔ چنانچہ اس رعایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اکبر خان نے کمیشن کے لئے فوج میں درخواست دی۔ سینکڑوں درخواست گزاروں میں سے دس پندرہ نوجوانوں کو چنا گیا جن میں سے ایک اکبر خان بھی تھے۔ اگست ۱۹۳۲ء میں اکبر خان بحیثیت ایک آفیسر کیڈٹ انگلستان کی مشہور ملٹری اکیڈمی سینڈھرسٹ بھیج دیئے گئے۔ جہاں ڈیڑھ برس کی ٹریننگ کے بعد دسمبر ۱۹۳۳ء میں انہیں کمیشن ملی۔

ہندوستان واپس آنے پر پہلے ایک برس تک اکبر خان نے ایک گوروں کی پلٹن فرسٹ ہیمپشائر رجمنٹ میں کام کیا۔ اس پلٹن میں افسر اور جوان سب انگریز تھے، اکبر خان واحد ہندوستانی تھے بعد میں یعنی، ۱۹۳۵ء میں اکبر خان کو اپنی مستقل پلٹن چھٹی رائل بٹالین، فرنٹیر فورس رائفلز میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم سے قبل اکبر خان نے صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں میں فقیرایپی کے لشکروں کے خلاف فوجی ایکشن میں حصہ لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں پہلی دفعہ انہیں

قبائلیوں کی نشانہ بازی کا تجربہ ہوا' لیکن ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ کبھی بھی قبائلیوں کی گولیوں کی بوچھاڑ سے نہیں گھبرائے' اور یہ "بے نیازی" تمام سروس کے دوران ان کا طرہ امتیاز رہی۔

۱۹۳۹ء میں جنرل اکبر خان نے مسلم لیگ کی لیڈر بیگم شاہ نواز کی بیٹی نسیم شاہ نواز سے شادی کی' یہ شادی بیس سال تک چلی۔ ۱۹۵۹ء میں اکبر خان نے نسیم کو طلاق دے دی۔

دوسری جنگ عظیم میں اکبر خان نے برما کے محاذ پر جاپانیوں کے خلاف لڑائی میں دادِ شجاعت پائی۔ ایک معرکہ میں انھوں نے اپنے جوانوں کے ہمراہ ۹۲ جاپانیوں کو مارا اور ۱۰۰ سے زیادہ کو زخمی کیا۔ مرنے والوں میں جاپانی پلٹن کا کمانڈر بھی تھا۔ اکبر خان کی پلٹن کے ایک افسر' تین وی سی او اور ۳۱ جوان بھی اس معرکے میں کام آئے۔

یہ واقعہ فروری ۱۹۴۵ء کا ہے۔ اس ایکشن میں انڈین آرمی کے جمعدار پرکاش سنگھ (آنجہانی) کو بہادری کا سب سے بڑا تمغہ وکٹوریہ کراس دیا گیا اور میجر اکبر خان کو ڈی ایس او (DSO) سے نوازا گیا۔

ڈی ایس او کا تمغہ حاصل کرنے کے بعد اکبر خان کو ہندوستان واپس بلا لیا گیا اور لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔

تقسیم ہند کے فوراً بعد ریاست جموں و کشمیر میں وسیع پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے اور یہ مسئلہ ابھر کر سامنے آیا کہ اس ریاست کا الحاق ہندوستان سے ہو گا یا پاکستان سے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اکبر خان کا کلیدی کردار شروع ہوتا ہے اور اس کتاب میں جسے اب آپ پڑھیں گے' اکبر خان نے ان تمام واقعات کو بڑے سیدھے سادھے انداز میں رقم کیا ہے۔ جو پہلی جنگ کشمیر سے قبل' اس کے دوران اور بعد میں ظہور پذیر ہوئے۔

کشمیر کی لڑائی کا ایک شاخسانہ راولپنڈی سازش کیس بھی تھا' جس کے تحت میجر جنرل اکبر خان کو ۱۹۵۱ء میں دس دوسرے فوجی افسروں اور چار سویلین لوگوں کے ہمراہ گرفتار کیا گیا۔ ان چار میں ایک خاتون بھی تھیں۔ یعنی اکبر خان کی اہلیہ بیگم نسیم جہاں' یہ خاکسار ان دس فوجی افسروں میں سے ایک تھا' جس نے اکبر خان کے ساتھ اسیری کے چار سال سے کچھ زیادہ عرصہ لاہور اور حیدر آباد جیل میں گزارا۔

جیل سے پہلے اکبر خان سے میری واقفیت نہایت سرسری سی تھی۔ ویسے بھی فوج کے ڈسپلن اور رینک سسٹم کی بدولت ایک کیپٹن ایک میجر جنرل سے زیادہ گھل مل نہیں سکتا۔ لیکن اسیری میں رینک اور عہدے سب ختم ہو جاتے ہیں اور تمام قیدی نہ صرف ایک سطح

پر آ جاتے ہیں بلکہ طویل رفاقت انہیں ایک دوسرے سے بہت قریب لے آتی ہے۔ قید خانے میں دوستی اور محبت کے جو رشتے استوار ہوتے ہیں وہ کافی پائیدار ہوتے ہیں۔ ان میں جذباتیت کا عنصر بھی غالب ہوتا ہے۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ جب رہائی کے کئی سالوں بعد میں دوبارہ اپنے ایک ساتھی اسیر' فیض احمد فیض سے ملا تو گلے لگتے ہی مرے آنسو پھوٹ پڑے اور میں کئی منٹ تک زاروقطار روتا رہا۔

یہ کتاب راولپنڈی سازش کیس کے متعلق نہیں ہے' یہ کتاب کشمیر کی پہلی جنگ کا تذکرہ اور تجزیہ ہے۔ لیکن جنرل اکبر خان کی ذات راولپنڈی سازش کیس سے اس قدر منسلک ہو چکی ہے کہ اس واقعہ کا ذکر بہرصورت ہو ہی جاتا ہے۔ جنرل صاحب سے میرے مراسم جیل خانے میں ہی استوار ہوئے اور اللہ کے فضل و کرم سے آج تک قائم ہیں۔

جنرل اکبر خان جوانی میں نہایت خوش شکل' وجیہہ اور خوف سے بے نیاز انسان تھے۔ وہ ایسے باہمت اور بہادر فوجی افسر تھے جن کی ہر سپاہی عزت کرتا ہے اور ہر حکم بسرو چشم بجالاتا ہے۔ ایسے نڈر اور بیباک جرنیل قوم کا گراں قدر سرمایہ ہوتے ہیں۔

جنرل صاحب کی عمر اب اسی برس سے تجاوز کر چکی ہے اور کچھ عرصے پہلے انہیں ایک اسٹروک ہوا تھا جس کی بدولت ان کی زبان میں رکاوٹ سی پیدا ہو گئی ہے۔ اور انہیں بات چیت میں ذرا دشواری ہوتی ہے لیکن وہ اب بھی لکھ پڑھ لیتے ہیں اور ان کا ذہن ٹھیک ٹھاک ہے۔ اب وہ اپنی دوسری بیگم فرحت کے ساتھ ڈیفنس سوسائٹی کراچی میں رہتے ہیں' جن سے انہوں نے شادی نسیم جہاں سے علیحدگی کے بعد ۱۹۷۰ء میں کی تھی۔ فرحت ان کا بہت خیال رکھتی ہیں اور وہ دونوں کچھ مالی مسائل کے باوجود کافی مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔

میں جنرل صاحب کو ملنے ان کے گھر پر مہینے میں ایک آدھ بار چلا جاتا ہوں' مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور حد درجہ شفقت سے پیش آتے ہیں۔ میری یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میجر جنرل محمد اکبر خان کو طویل عمر دے' ان کی صحت ٹھیک رہے اور مجھے عرصے تک ان کی رفاقت نصیب ہو۔

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے!

ظفر اللہ پوشنی

پیش لفظ

نہرو ہمیں چھاپہ مار کہتے تھے۔اس سے ان کا مقصد ہماری تحقیر تھا مگر جو بات ان کے علم میں نہیں تھی' یہ ہے کہ آج کل جنگ کے فن کے اس انتہائی شعبہ کو انتہائی ترقی یافتہ سمجھا اور قبول کیا جاتا ہے' طیارے' چھاپہ مار' کمانڈو' ٹینک اور آرٹلری گروپ' آبدوزیں حتیٰ کہ چوغہ پوش خنجروں والی روایت کو بھی 'حملہ کرو اور چھپ جاؤ' کے طریق کار کو جنگ کے دوران مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی توہین کے بغیر ہم چھاپہ ماروں کا نام جہاں تک صوبہ سرحد کے جنگجوؤں کا تعلق ہے' قبول کر سکتے ہیں۔فوجی اعتبار سے وہ انتہائی قابل اور دلیر چھاپہ مار ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس طرح ہمارا شمار چنگیز خان' تیمور لنگ' محمود غزنی حتیٰ کہ سکندر جیسی نامور شخصیتوں میں ہوتا ہے انہیں بعض مورخین نے چھاپہ مار کا نام دیا ہے۔

یہ کتاب' ذاتی بیان کے حوالہ سے قارئین کو جنگ کے متعلق اور مسئلہ کے بارے میں مجموعی صورتحال سے آگاہ کرے گی۔ سترھواں باب۔ 'اب کشمیر کو کیسے آزاد کیا جا سکتا ہے' جنگ بندی کے بعد آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں ہے' آخری باب قبائلیوں کی تاریخ پر ہے' میں ان تمام افراد کا شکرگزار ہوں جنہوں نے کئی طریقوں سے میری مدد کی اور ان کا بھی جن کے میں نے اس کتاب میں حوالے دیئے ہیں۔

اکبر خان

راولپنڈی سازش مقدمہ

میجر جنرل ریٹائرڈ محمد اکبر خان پاک فوج کے ان جرنیلوں میں سے ہیں جو نو آزاد مملکت کی تشکیل کے اولیں برسوں میں ہی 'راولپنڈی سازش' کے نام سے ایک مقدمہ کے ملزم بنائے گئے۔ انہوں نے اسلامیہ کالج پشاور سے تعلیم حاصل کی اور بعد فوجی تربیت کیلئے سندھرسٹ (برطانیہ) گئے۔ ۱۹۳۵ء میں وہ فرنٹیر فورس رائفلز میں شامل ہوئے اور وزیرستان اپریشن (۳۸-۱۹۳۷ء) میں حصہ لیا۔

دوسری عالمی جنگ میں وہ چودھویں بٹالین' برما میں ۲۰ ویں ڈویژن میں شامل تھے۔ انہوں نے اراوتی دریا پار کرنے کی مہم اور کانلن پوائنٹ میں حصہ لیا جہاں انہیں ڈی ایس او (ڈسٹنگویشڈ سروس آرڈر) ملا' ۱۹۴۷ء میں وہ مسلح افواج پارٹیشن سب کمیٹی میں شامل تھے بعد میں وہ جنرل طارق بن کر کشمیر کی مہم میں شریک ہوئے-اس کتاب میں اسی لڑائی کا احوال ہے-غیر مشروط جنگ بندی کے بعد وہ کشمیری عوام کی تحریک آزادی میں ان کی مدد پر زور دیتے رہے۔ دسمبر ۱۹۵۰ء میں انہیں میجر جنرل کے عہدہ پر ترقی دی گئی اور وہ چیف آف دی جنرل سٹاف بنائے گئے-کچھ ہی دیر بعد مارچ ۱۹۵۱ء میں انہیں گرفتار کر لیا گیا-مقدمہ کی بند کمرے میں سماعت ہوئی اور ۱۴ برس قید کی سزا دی گئی-یہ مقدمہ پنڈی سازش کیس کے نام سے معروف ہے۔

مئی ۱۹۵۵ء میں چار سال سے زیادہ عرصہ تک سزا بھگتنے کے بعد انہیں لاہور ہائی کورٹ سے ضمانت پر رہائی ملی-ان کی جانب سے حبس بیجا سے رہائی کی درخواست دائر کی گئی تھی۔ ۶۴-۱۹۶۳ میں انہوں نے قانون کی تعلیم حاصل کر کے ڈگری لی اور کراچی میں پریکٹس کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۸ء میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے اور ایوب خان کے خلاف تحریک میں حصہ لیا جس کے نتیجہ میں ایوب خاں معزول ہوئے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت میں وہ داخلی سلامتی کے وزیر مملکت اور بعد ازاں چیکوسلاویکیہ میں سفیر مقرر ہوئے۔

'راولپنڈی سازش' کے حوالہ سے خود ان کا اپنا بیان ہے کہ ۲۲ فروری ۱۹۵۱ء کو میرے گھر پر وہ آخری اجلاس ہوا جسے بعد میں راولپنڈی سازش کا نام دیا گیا۔ اس اجلاس میں چند دوسرے افراد کے علاوہ پاکستان ٹائمز کے فیض احمد فیض اور محمد حسین عطا بھی شریک تھے' سات گھنٹوں کے غور و خوض کے بعد اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ مجوزہ اقدام نہیں کیا جائے گا۔

اجلاس میں جو تجویز میں نے پیش کی تھی اس کا مقصود یہ تھا کہ کشمیر میں کسی طرح کی کارروائی کرنے سے پہلے پاکستان میں ایک ایسی حکومت کے قیام کی ضرورت ہے جو ہماری پشت پناہی کرے' گورنر جنرل کے لئے مجوزہ اعلان جو میرے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے' راولپنڈی سازش کیس کی یادداشتوں میں اب تک محفوظ ہے۔ اس اعلان کی خاص خاص باتیں یہ تھیں کہ پرانی حکومت برخاست کر دی جائے گی اور ایک نگران سول گورنمنٹ قائم کر دی جائے گی۔ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کی تاریخ مقرر ہو گی۔ آئین مرتب کرنے کے لئے ایک آئین ساز اسمبلی بنائی جائے گی۔ فوج کی غیر جانب دار مشینری استعمال کر کے انتخابات کے غیر جانب دار ہونے کی ضمانت دی جائے گی۔ اور تمام جرنلوں پر مشتمل ایک مشاورتی فوجی کونسل قائم کی جائے گی۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ میری ان تجاویز میں سے کوئی بات ان کارروائیوں سے مماثلت نہیں رکھتی تھی جو بعد میں ایوب خاں نے انجام دیں۔ انہوں نے دو بار آئین منسوخ کیا جب کہ اس اعلان سے ایک جمہوری آئین وجود میں آتا۔ ملک میں انہوں نے دو بار مارشل لا نافذ کیا جب کہ اس موقع پر عام شہری قوانین میں مداخلت کا دور دور تک کوئی ارادہ نہ تھا۔ انہوں نے دو بار اس ملک میں آمریت نافذ کی جب کہ یہاں یہ ارادہ تھا کہ آئین سے بتدریج گریز کرتے ہوئے جو بات آمریت کا خطرہ بن سکتی ہے اس کا قلع قمع کر دیا جائے۔

اس وقت اس معاملہ میں بہت کچھ کہا گیا اور جب سے اب تک بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے کہ ہم نے اگر یہ کارروائی کی ہوتی تو بہت سے لوگوں کو ہلاک کر دیا جاتا اور معلوم نہیں کیا کچھ ہوتا۔ لیکن یہ سب باتیں قطعاً غلط ہیں۔ مقدمہ سازش میں استغاثہ کے اپنے گواہوں نے اور سلطانی گواہوں نے بھی عدالت کے صریح سوالوں کے جواب میں یہ شہادت دی کہ کسی شخص کو گولی مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا بلکہ دراصل کوئی فرد گرفتار بھی نہ ہوتا۔ ٹریبونل کے چیئرمین جسٹس سر عبدالرحمٰن بہت حیران ہوئے جب انہیں مختلف سوالوں کے یہ

جواب ملے کہ میں نے بندوقوں کو کارتوس سے خالی رکھنے کی ہدایت دی تھی اور یہ کہ ایک فرد بھی میری رائے میں گرفتاری کے لائق نہیں تھا۔ اس کے باوجود کہ یہ حقائق ہر شخص کو بخوبی معلوم تھے لیکن بہت سے لوگ اب تک یہ دعوے کرتے رہے کہ ہمیں ہلاک یا گرفتار کیا جانے والا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کی نظر میں مقبول اور محبوب بن جائیں۔

میرے خیال کی رو سے ۲۳ تاریخ کے فیصلے کے بعد سارا معاملہ ختم ہو گیا۔ اور اب میرے لئے کچھ اور کرنا باقی نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے یہ تو نہیں سوچا تھا کہ جو کچھ اب تک ہو چکا ہے حکومت کو اس کی خبر نہیں ہو گی۔ البتہ میں اس کارروائی سے بے خبر تھا جو میرے خلاف شروع کی جا چکی تھی۔ پنجاب میں انتخابات سے عین ایک روز پہلے ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کی صبح کو ہمیں گرفتار کر لینے کا منصوبہ تیار کیا جا چکا تھا۔

جس صبح گرفتاریاں ہونے والی تھیں اس سے پہلے رات میں لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجہ جنہیں بعد میں سلطانی گواہ بننا تھا اور جو اپنی رپورٹ جنرل ایوب خاں کو پہلے ہی پہنچا چکے تھے، یہ اطلاع دینے کے لئے میرے پاس آئے کہ آپ کے خلاف کارروائی ہونے والی ہے اور اس مفہوم کی زبردست افواہیں پھیل چکی ہیں۔ انہیں میری حفاظت کے سلسلہ میں بظاہر بڑی تشویش تھی۔ لہٰذا انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ آپ کو حفاظتی تدبیریں کر لینی چاہئیں۔ میں نے انہیں یہ جواب دیا کہ میں اپنے اعمال کی تمام تر ذمہ داری قبول کروں گا اور اس کے نتائج کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہوں گا۔ میں یہ امید کر رہا تھا کہ میرے خلاف اگر کوئی کارروائی کی گئی تو وہ کارروائی یقیناً قانون کے مطابق ہو گی۔ یعنی یہ کہ افسر کو مکان میں نظر بند کر دیا جاتا ہے۔ اسے کمانڈر انچیف کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس پر فرد جرم عائد ہوتی ہے۔ اس کے بعد تحقیقات ہوتی ہے اور تب کورٹ مارشل ہوتا ہے۔ اگر یہ بات تھی تو میرا ارادہ کسی بات کو چھپانے کا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کاغذات میں سے ایک بھی کاغذ، خطوط اور دستاویزات وغیرہ تلف نہیں کیں۔ اور اسی لئے آخری رات میں بھی، جب کہ دو مختلف ذرائع سے مجھے خبردار کیا جا چکا تھا، میں نہایت اطمینان سے سویا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ کسی بھی قانونی طریق کار کی پابندی نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ میں جس وقت گہری نیند سویا ہوا تھا۔ صبح کے جھٹپٹے میں کوئی ایک سو آدمیوں نے میرے مکان کو گھیر لیا اور ایک چوکیدار تھا، جسے انہوں نے نہایت کامیابی سے دبوچ لیا۔ اس کے بعد صبح کے ٦ بجے میجر جنرل حیاء الدین نے میری خواب گاہ کی کھڑکی پر دستک دی

اور کہا کہ ایک نہایت اہم معاملے میں مجھے آپ سے فوراً ملنا ہے۔ یہ سنتا تھا کہ میں ان سے ملنے کے لئے جوتا پہنے بغیر ننگے پاؤں بے اختیار باہر نکل پڑا۔ جونہی میں باہر نکلا، سنگینیں اور اسٹین گنیں تانے ہوئے لوگ سامنے اور دائیں بائیں غرض تین طرف سے مجھ پہ جھپٹے۔

اس سے پہلے بھی میدان جنگ میں، جاپانیوں کے ساتھ جھڑپوں کے دوران میں دشمن کے سپاہی مجھ پر جھپٹے تھے لیکن اس طرح کی جھڑپوں میں ایک اور بیس کی نسبت تو کبھی بھی نہ تھی، اور نہ میں ان میں نہتا تھا۔ مجھے صرف ایک پلک جھپکنے میں فیصلہ کرنا تھا۔ میں نے انہیں آنے دیا اور میرا خیال ہے کہ یہ طفلانہ کھیل چونکہ مجھے متاثر کرنے میں یکسر ناکام رہا اس لئے میری طرف جھپٹنے والے لوگ بیچ میں ہی ٹھٹک کر رک گئے، اور ان چند لوگوں نے جنہوں نے مجھ پر ہاتھ ڈالا تھا، فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔

یہ بتانے کے لئے کہ میں زیر حراست ہوں محض ٹیلی فون پر اطلاع دے دینا کافی تھا۔ لیکن اس معاملہ کو اس سے کہیں زیادہ اہم قیاس کیا گیا تھا۔ فوجوں کو تاکید کر دی گئی کہ فی الفور چوکس ہو جائیں اور وہ لوگ جو میرے یہاں آئے تھے انہیں بظاہر یہ اندیشہ تھا کہ گھمسان کی لڑائی میں انہیں بندوقیں ڈال دینا پڑے گا۔ اس کے خاصے عرصے بعد مقدمے کے دوران میں استغاثہ کے وکیل مسٹر اے کے بروہی، عدالت کو اس طرف توجہ دلا کر بار بار اور بہ اصرار یہ کہتے رہے کہ ریوالور جو میرے سرہانے پایا گیا، اس میں گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس لطیفے کی شان نزول یہ تھی کہ جنرل ایوب خاں کے یقین کے مطابق دو ڈویژن فوجیں میری حمایت کے لئے ایک آواز کی منتظر کھڑی تھیں یہ دونوں ڈویژن کہاں تھے۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ پاکستانی افواج میں تو ان کا وجود نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو بریگیڈیئر حبیب اللہ اور لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجہ سے انہیں اس کی اطلاع مل چکی ہوتی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ تمام ڈویژنل کمانڈروں سے پہلے ہی رابطہ قائم کر چکے تھے۔ اتنی بھاری بھرکم فوج جس میں کوئی تیس ہزار آدمی شامل ہوتے ظاہر ہے کہ میرے مکان کے اندر یا کہیں اس کے آس پاس اس کامیابی سے تو نہیں چھپ سکتی تھی کہ اس کی موجودگی کی کسی کو جھلک بھی نہ ملے۔

یہ بات قیاس میں نہیں آتی۔ تاہم یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آدمی کی پرواز تخیل اسے کہاں تک لے جا سکتی ہے۔ پھر ایک ایسا شخص جو ہمالیہ کے آر پار روسیوں کی پیش قدمی کو بھانپ سکتا تھا، اسے تو یہ بات بالکل ہی بے سروپا نظر آنی چاہئے تھی۔

باب ۱

چھاپہ مار

صدیوں سے پشاور کے بازاروں میں داستان گوئی کا فن جاری و ساری ہے اور میں نے خود بھی ایسی داستانیں ان ماہرین داستان گوؤں سے سنی ہیں جو مختلف جنگی اور تاریخی واقعات کو ایسے انداز میں سامعین کو سناتے ہیں کہ سننے والا خود کو اس کہانی کے کرداروں کا ایک حصہ محسوس کرنے لگتا ہے مگر آج مجھے یہ داستان بیان کرتے ہوئے لگتا ہے کہ داستان گوئی کا فن اتنا آسان نہیں کہ ہر کوئی اس کو اختیار کرے۔ مجھے خود یہ مشکل پیش آ رہی ہے کہ میں اپنی داستان کو کیسے اور کہاں سے شروع کروں' لہٰذا میں اپنی داستان کی ابتدا وہاں سے کر رہا ہوں جہاں گہری تاریکی اور دھند میں لمبے انسانی ہیولے وادی کشمیر میں چیتے کی پھرتی اور چالاکی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے اور بغیر کسی دِقّت اور رکاوٹ کے دشمن کے علاقہ میں پیش قدمی کر رہے تھے۔

یہ تھے وہ چھاپہ مار رات کی تاریکی میں یہ لوگ انتہائی خاموشی کے ساتھ اس طرح آگے بڑھ رہے تھے جیسے یہ ان کے روز کا معمول ہو کیونکہ ان کو پیش قدمی میں نہ تو کوئی ہچکچاہٹ تھی اور نہ ہی رکاوٹ اور اس طرح وہ غیرہموار پہاڑی علاقے اور کھیتوں کو عبور کرتے ہوئے دشمن کے سر پر پہنچ رہے تھے۔

یہ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب کا واقعہ ہے کہ یہ چھاپہ مار بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دشمن کے علاقے میں داخل ہوئے۔ان کی تیزرفتاری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک سو پندرہ میل کا فاصلہ پانچ روز میں طے کرتے ہوئے سرینگر سے صرف چار میل کے فاصلے پر پہنچ گئے جہاں سے سرینگر کی ٹمٹماتی روشنیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

وہ بارہ مولا کو ۳۰ میل پیچھے چھوڑ آئے تھے اور یہاں تک پہنچتے پہنچتے ان کی تعداد صرف تین ہزار رہ گئی تھی جبکہ ابتدا میں یہ لوگ چودہ ہزار پر مشتمل تھے۔مہاراجہ کشمیر سرینگر سے فرار ہو کر دہلی پہنچ گیا تھا اور بھارتی حکومت سے مدد کی درخواست کرتے ہوئے یہ موقف پیش کر رہا تھا کہ کشمیر پر وحشی جنگی قبائل نے حملہ کر دیا ہے اور اگر ابھی سے

-

اس خطرے کا سدباب نہ کیا گیا تو ان وحشی جنگی قبائل کی اگلی منزل دہلی ہو گی اس موقف کو وی پی مینن نے بڑے زور شور کے ساتھ دہرایا اور بھارتی حکومت کو یاد دلایا کہ اگر اس وقت کشمیر کی حفاظت نہ کی گئی تو آٹھ صدی قبل جس طرح افغانوں نے شمالی ہندوستان کو روندتے ہوئے سترہ مرتبہ بھارت کو تاخت و تاراج کیا تھا اسی طرح اب وہ تاریخ پھر دہرائی جائے گی آج سرینگر تو کل دہلی کو اسی قسم کے حملے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

اگلے ہی روز بھارتی فوجیوں کی جنگی کمک ہوائی جہازوں کے ذریعے کشمیر پہنچنا شروع ہو گئی اور ان دستوں کی مدد بھارتی جنگی جہاز و توپ خانہ کر رہا تھا اور یہ بھارتی فوجیں تیزی کے ساتھ قبائلی چھاپہ ماروں کی پیش قدمی روکنے کے لئے حرکت میں آ گئیں تھیں مگر افراتفری میں ان کا یہ حملہ انہی کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا قبائلیوں نے نہ صرف بھارتی فوج کو پیچھے دھکیل دیا بلکہ ان کا کمانڈر کرنل رائے بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ سرینگر کے قریب چوتھے میل پر جہاں توپ خانے نے مورچہ بندی کر رکھی تھی، راستہ لاشوں سے پٹا پڑا تھا اور دونوں متحارب طاقتیں پیش قدمی کے لئے مشین گنوں کی مدد سے راستہ بنانے کی کوشش کر رہی تھیں بھارتی فوج کا توپ خانہ بھی بھارتی فوجیوں کی مدد کر رہا تھا۔ جیسے جیسے یہ چھاپہ مار قبائلی آگے بڑھ رہے تھے، رکاوٹیں دوچند ہوتی جا رہی تھیں کیونکہ سرینگر کے اردگرد پھیلے ہوئے ندی نالے اور جھیلیں ان کی پیش قدمی کو مشکل ترین بنا رہی تھیں۔ لہٰذا مجبوراً انہیں سمٹ سمٹا کر اسی شارع پر آنا پڑتا جو سرینگر اور میدان جنگ کے درمیان تھی۔

باب ۲

وجوہ

وہ کونسی وجہ تھی جس نے قبائلیوں کو کشمیر آنے پر مجبور کیا۔ اصل میں یہ قبائلی بھی دنیا کے دیگر مسلمانوں کی طرح ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کی طرف سے فکرمند تھے اس واقعہ سے چار ماہ قبل ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر برطانوی سامراج سے آزاد ہو کر دو نئی مملکتوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور یہ دو نئے ملک ہندوستان اور پاکستان کے نام سے وجود میں آئے تھے۔یہ دونوں ریاستیں خودمختار تسلیم کی گئیں تاہم ان دونوں ریاستوں کو برطانوی کامن ویلتھ کا حصہ ہی رہنا تھا۔گو اس دن سے برطانوی حکمرانوں نے برصغیر پر اپنے اختیارات کے خاتمہ کا اعلان کر دیا تھا مگر یہ دونوں ملک اپنے اختیارات کے استعمال سے قاصر رکھے گئے کیونکہ ۸۳۴،۷۷،۱ مربع میل پر پھیلے ہوئے وسیع رقبہ میں جہاں چالیس کروڑ انسان آباد تھے' ۵۶۸ ایسی ریاستیں بھی موجود تھیں جو مختلف راجاؤں' مہاراجوں' نوابوں کے زیرنگیں تھیں اور ان میں سے بیشتر وہ ریاستیں بھی تھیں جن کے حکمرانوں نے دونوں میں سے کسی بھی ملک کے ساتھ الحاق کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔

ان ریاستوں کے حکمرانوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ دونوں میں سے کسی بھی ایک ملک کے ساتھ الحاق کر سکتے ہیں کیونکہ ایسے حالات میں ان کے خودمختار رہنے کا کوئی نہ تو جواز تھا اور نہ ہی وسائل۔ ان کے متعلق یہ بھی سوچ لیا گیا تھا کہ یہ ریاستیں اور ان کے حکمران اپنے فیصلے کا اعلان مقررہ تاریخ یا اس کے فوری بعد کر دیں گے۔ بیشتر ریاستوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں کون سے ملک کے ساتھ رہنا ہے کیونکہ جغرافیائی اعتبار سے ایسی تمام ریاستیں پاکستان یا بھارت کی حد کے اندر ہی واقع تھیں اور ان کے الحاق کا اعلان محض ایک رسمی کارروائی سے زیادہ کچھ نہ تھا ایسی ریاستیں جنہوں نے تاحال اپنے الحاق کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا ان میں سب سے اہم ریاست کشمیر تھی جو برصغیر کی دوسری بڑی ریاست تھی اور جس کی جغرافیائی حیثیت اس اعتبار سے بھی انتہائی اہم تھی کہ یہ ریاست نہ صرف بھارت اور پاکستان سے متصل ہے جبکہ ایک چھوٹی سی پٹی کے بعد شمال میں اس کی سرحدیں

افغانستان سے جا ملتی ہیں جو سوویت یونین کے پڑوس میں واقعہ ہے۔اور دوسری طرف اس کی سرحد عوامی جمہوریہ چین تک پھیلی ہوئی ہے۔ برصغیر کی آزادی کے برطانوی اعلان کے ساتھ ہی یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ ریاست کشمیر پاکستان میں شامل ہو گی کیونکہ پاکستان کے ابتدائی خاکہ میں حرف "ک" اس کی علامت تھا کہ کشمیر پاکستان کا لازمی حصہ ہو گا کیونکہ برصغیر کی تقسیم میں اس امر کو ملحوظ رکھنے کا وعدہ کیا گیا تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی وہ پاکستان میں شامل ہوں گے اور ایسے علاقے جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہو گی انہیں ہندوستان کا حصہ بنایا جائے گا۔

کشمیر کو اس لئے بھی پاکستان کا لازمی جزو تصور کیا گیا کہ ریاست کشمیر کی چار کروڑ آبادی میں اسی فیصد مسلمان تھے اور اس کا ۸۴٬۵۰۰ مربع میل پر مشتمل پھیلا ہوا رقبہ دشوار گزار پہاڑیوں' ندی نالوں کی وجہ سے برصغیر سے بالکل الگ تھلگ تھا البتہ برصغیر کو ملانے والی دونوں شاہراہیں ایسے حصہ میں تھیں جو پاکستان میں شامل ہے۔

انہی وجوہ کی بناء پر یہ یقین پختہ تر ہو گیا تھا کہ کشمیر پاکستان کا حصہ ہو گا کیونکہ کشمیر کی مسلمان آبادی کے تعلقات اور رشتہ داریاں انہی لوگوں سے تھیں جو ایسے علاقوں میں آباد تھے جو پاکستان کا حصہ تصور کر لئے گئے تھے۔ کشمیر کے حکمران مہاراجہ نے یہ فیصلہ کرنے میں کہ اسے پاکستان یا ہندوستان میں سے کس کے ساتھ الحاق کرنا ہے اس لئے تاخیر کی کہ وہ خود ہندو تھا اور پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے میں ہچکچا رہا تھا۔ برصغیر کی آزادی کے اعلان سے تھوڑا عرصہ قبل ہی قائداعظم محمد علی جناح کو آزاد پاکستان کا گورنر جنرل نامزد کر دیا گیا تھا مگر تاحال وہ دہلی میں مقیم تھے وہاں کشمیری رہنماؤں کا وفد ان سے ملاقات کرنے آیا اور کشمیری عوام کی اس خواہش کا اظہار کیا کہ کشمیر پاکستان کا حصہ ہونا چاہئے اور کشمیری عوام اس مقصد کے لئے ہر قسم کا تعاون کرنے پر تیار ہیں۔ اس وفد میں کچھ فوجی افسر بھی شامل تھے جن میں سے ایک میں خود تھا۔ہم نے قائداعظم سے اس خدشے کا اظہار کیا کہ مہاراجہ کشمیر کو پاکستان میں شامل کرنے پر تیار نہیں ہو گا اور اس خدشے کو تقویت اس بات سے بھی مل گئی کہ ریاست کے وزیراعظم شیخ عبداللہ مہاراجہ کا ساتھ دیں گے کیونکہ شیخ عبداللہ انڈین نیشنل کانگریس کے معروف رہنما ہیں اور انہوں نے ہمیشہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ تاہم قائداعظم نے وفد کو اس امر کی یقین دہانی کرائی کہ ان دو افراد کی خواہش اور ان کا فیصلہ چار کروڑ کشمیری عوام کے فیصلے پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ قائداعظم نے کہا کہ یہ بات میں اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ پاکستان کا مطالبہ پورے برصغیر کے

مسلمانوں کی طرح کشمیری مسلمانوں کا بھی خواب بن چکا ہے اور دوسرا جغرافیائی اعتبار سے بھی کشمیریوں کے پاس پاکستان میں شامل ہونے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

اس تصور اور یقین کو پہلا دھچکا اس وقت لگا جب ریڈ کلف کمیشن نے ہندوستان اور پاکستان کے مابین سرحدوں کی حدبندی کا نقشہ پیش کیا اور اس پٹی کو ہندوستان کا حصہ قرار دے دیا جہاں مسلمان اکثریت آباد تھی اور یہ وہ علاقہ تھا جہاں سے برصغیر سے کشمیر تک رسائی کے لئے ایک شاہراہ موجود تھی اور یہ سارا علاقہ حقیقی معنوں میں انہی علاقوں کا ایک تسلسل تھا جہاں مسلم آبادی کی اکثریت ہونے کے ناطے اسے پاکستان کا حصہ ہونا چاہئے تھا۔ دراصل جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کشمیر تک پہنچنے کے لئے دو ہی راستے موجود تھے اور یہ دونوں شاہراہیں برصغیر کے ان علاقوں سے منسلک تھیں جو پاکستان کا حصہ تصور کر لئے گئے تھے مگر ریڈ کلف کمیشن نے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور کشمیر کو جانے والی دوسری شاہراہ موجود تھی کاٹ کر بھارت کا حصہ قرار دے دیئے اور اس طرح بھارت کو سرینگر تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ رہی کہ لیتھویہ سرینگر روڈ کی تعمیر سے بھارت کا ہر مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔

اس طریقے سے کم ازکم بھارت کے لئے راستہ ہموار ہو گیا جس کے تحت اس نے کشمیر میں دسترس حاصل کر لی اور کشمیر تک اپنی رسائی کو ممکن بنایا اور ساتھ ہی مہاراجہ کے لئے یہ آسانی بھی پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے اور ریاست کشمیر کے لئے بھارتی حکومت سے مذاکرات کر سکے۔ جہاں تک کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا تعلق ہے اس میں کبھی بھی کوئی مشکل نہیں رہی اس کے ساتھ ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس بیان کو بھی خاصی اہمیت حاصل تھی جس میں انہوں نے واضح الفاظ میں یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ "اگر کشمیر کا الحاق پاکستان سے ہو گیا تو بھارتی حکومت کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس وقت یعنی جولائی ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل تھے۔جہاں تک پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کا تعلق ہے'اس راستے میں تو کوئی دشواری تھی ہی نہیں۔جہاں تک مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کا تعلق ہے وہ اس وقت جیل میں ہونے کی بناء پر کوئی مسئلہ کھڑا کرنے کی پوزیشن میں ہی نہ تھے اس کے باوجود مہاراجہ کشمیر گومگو کی حالت میں تھا بلکہ کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے فیصلے سے گریزاں رہا وہ یہ سمجھتا رہا کہ اس نے بھارتی حکومت کا سہارا لے کر اپنے لئے حفاظتی دیوار کھڑی کر لی مگر حقیقت اس کے برعکس تھی اس کے اس فیصلہ سے اس کی حالت وہی تھی جو کسی ایسے شخص کی ہو سکتی ہے

13709

جو کسی ایسے آتش فشاں پہ بیٹھا ہو جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ مہاراجہ کے اس رویہ نے کشمیری مسلمانوں کے دلوں میں شکوک اور شبہات پیدا کر دیئے اور ریاست کشمیر بھی اسی لہر کی لپیٹ میں آگئی جس نے پورے برصغیر میں آگ اور خون کی ہولی کا سماں باندھ دیا تھا۔

کئی دہائیوں سے انڈین نیشنل کانگرس یہی پرچار کرتی رہی کہ پورے برصغیر کو غیر منقسم طور پر برطانوی سامراج سے آزاد ہونا چاہئے اور وہ اس غیر منقسم ہندوستان میں ایسا جمہوری نظام قائم کریں گے جس میں جمہوری طریقے سے اکثریت کو حکمرانی کا حق حاصل ہو گا مگر برصغیر کے مسلمان یہ محسوس کرنے میں حق بجانب تھے کہ انڈین نیشنل کانگریس کے دعویٰ کے مطابق اکثریت ہی کو حکمرانی کا حق حاصل ہو گا تو برصغیر میں مسلم اقلیت غیر مسلموں کی مستقل طور پر محکوم ہو کر رہ جائے گی یہی وہ خدشات تھے جن کی بنا پر مسلم رہنماؤں نے مسلم اقلیت کی نمائندگی کرتے ہوئے مسلمانوں کے لئے الگ وطن کا مطالبہ کیا تھا۔ اور اس مطالبے کو نہ صرف شک و شبہ بلکہ نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا گیا اور اس مطالبے کے خلاف اتنی شدت سے طوفان کھڑا کیا گیا کہ پورا برصغیر لوٹ مار اور قتل و غارت کی لپیٹ میں آگیا اور فرقہ وارانہ فسادات شہر شہر، گلی گلی میں پھیل گئے جب آخرکار برصغیر کی تقسیم کا وقت آیا تو ملک کے کونے کونے سے نقل مکانی اور ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ اتنی وسیع پیمانے پر نقل مکانی کا سلسلہ وجود میں آیا اور اس طرح پورا برصغیر مذہبی جنون اور نفرت کی لپیٹ میں آگیا ایسی صورت حال میں ریاست کشمیر کس طرح ان حالات سے محفوظ رہ سکتی تھی۔

غیر مسلم آبادی جو کہ مسلم اقلیتی علاقوں میں آباد تھی خوف و دہشت کا شکار تھی وہ مسلم آبادی جو ہندو اکثریتی علاقوں میں مقیم تھی، ننگی جارحیت کے سامنے قطعی طور پر غیر مسلح تھی ان حالات میں بھی اگر کشمیر میں قتل و غارت کا ڈرامہ نہیں کھیلا گیا تو اس میں کشمیری مسلمانوں کی کمزوری کے بجائے ان کے حوصلے اور صبر و تحمل کو بہت بڑا دخل حاصل تھا جس کے لئے انہیں بجا طور پر خراج تحسین پیش کیا جانا چاہئے مہاراجہ نے ایسے حالات میں کوئی مثبت فیصلہ نہ کیا بلکہ لوگوں کو گومگو کی حالت میں رکھتے ہوئے ان کے جذبات کو مشتعل کیا جبکہ برصغیر کی دیگر تمام ریاستیں کسی نہ کسی ملک کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر چکی تھیں۔ کشمیر واحد ریاست تھی جہاں مہاراجہ نہ صرف کوئی فیصلہ نہیں کر رہا تھا بلکہ وہاں کے عوام کو کسی قسم کا آئینی، سیاسی اور قانونی حق دینے پر بھی رضامند نہ تھا بلکہ

بیشتر سیاسی رہنماؤں کو جیلوں میں ٹھونس رکھا تھا۔ حتیٰ کہ اسے اس امر کی بھی پروا نہ تھی کہ سیاسی رہنماؤں کو جیلوں سے آزاد کر کے عوام کو مطمئن کرنے کی زحمت گوارا کرتا اس قسم کی حکمت عملی کے جو نتائج برآمد ہو سکتے ہیں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اور بالآخر وہی کچھ ہوا جو حالات کا منطقی نتیجہ تھا۔

باب ۳

بغاوت

برصغیر کی تقسیم کے دو ہفتے بعد ماہ ستمبر کے اوائل میں مجھے مری جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ مقام ریاست کشمیر کی سرحد کے بالکل ساتھ واقعہ ہے اور یہ جگہ صحت افزا مقام ہونے کی بنا پر گرمیوں میں دور دراز سے آنے والے سیاحوں سے اٹی رہتی ہے۔ مگر اس وقت سیاح تو جا چکے تھے مگر شہر میں کشمیر سے آنے والے مہاجروں کے قافلوں نے گہما گہمی پیدا کر رکھی تھی۔ کشمیر سے آنے والے ان مہاجروں کی زبانی یہ کہانیاں زبان زدعام تھیں کہ کشمیر میں نہ صرف مسلح ہندو بلکہ ریاستی پولیس اور فوج بھی مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھا رہی ہے اور محسوس یہ ہو رہا تھا کہ کشمیر میں ظلم و بربریت کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔

اگر اوپر بیان کی گئی کہانیوں میں مبالغہ آرائی کو خارج بھی کر دیا جائے تو بھی ایک بات واضح ہو چکی تھی کہ موجودہ حالات میں کسی بھی وقت کوئی طوفان کھڑا ہو سکتا تھا جس کی ابتداء پہلے ہی ہو چکی تھی۔ یہاں پر یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان حالات کا ذمہ دار کون ہے البتہ یہ ضرور محسوس کیا جا رہا تھا کہ اگر بھارتی حکومت چاہتی تو مہاراجہ کو یہ مشورہ دے سکتی تھی کہ وہ ریاست کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دے مگر بھارتی حکومت نے اس سلسلے میں مجرمانہ خاموشی اختیار کر لی بلکہ ریاست کی ہندو اقلیت کو مسلح کرنے میں مہاراجہ کی مدد کی۔ جہاں تک میرا ذاتی خیال تھا انڈین نیشنل کانگریس کے رہنما اگر ماضی میں مطالبہ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے تھے تو یہ ان کا جمہوری حق تھا' مگر اب جبکہ پاکستان وجود میں آ چکا تھا تو انہیں فراخدلی سے اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہئے تھا بلکہ پاکستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے تعاون بھی کرنا چاہئے۔ میں ذاتی طور پر گاندھی اور پنڈت نہرو کو فرقہ وارانہ خیالات سے بالاتر سمجھتا تھا اور یقین رکھتا تھا کہ یہ رہنما ایسے حالات میں انسان دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے فرقہ واریت کی مذمت کریں گے اور کشمیری عوام کو ان کے جائز مطالبات کے حصول میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں گے۔

مگر بھارتی رہنماؤں نے وہ راستہ اختیار کیا جس کے تحت دونوں آزاد ملکوں کے مابین

بہتر تعلقات قائم کرنے کے بجائے معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ ان حالات میں ہم خاموش تماشائی نہیں بن سکتے تھے کیونکہ اس طرح نہ صرف ہم اپنے کشمیری بھائیوں کو درندوں کے جنگل میں چھوڑ دیتے بلکہ کشمیر بھی بھارت کے ہاتھ میں چلا جاتا جو کہ ہماری اپنی یعنی پاکستان کی سلامتی کے لئے کسی بھی طرح موزوں نہ تھا۔

نقشے پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگر بھارتی فوجیں کشمیر کی سرحدوں پر اپنی فوجی چوکیاں قائم کر لیتی ہیں تو پاکستان کی سلامتی کو شدید خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ ایسی فوجی چوکیاں پاکستان کی اور ایک سو اسی میل طویل شاہراہ اور ریلوے لائن سے اس قدر قریب ہوں گی کہ لاہور، سیالکوٹ، گجرات حتیٰ کہ جہلم سے پنڈی تک سارا علاقہ بھارتی فوجوں کی براہ راست زد میں آ سکتا تھا۔ حالت جنگ میں لاہور جیسے اہم مقام کو بھی بھارتی فوجیں الگ سے کاٹ سکتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ شمال میں ہزارہ اور دیگر شمالی علاقے بھی بھارتی فوجوں کے لئے ترنوالہ ثابت ہوتے کیونکہ کشمیر کی سرحد پر قائم ان فوجی چوکیوں کے وجود سے پاکستان کے یہ علاقے قطعی غیر محفوظ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ سارے خدشات اسی صورت کے پیش نظر تھے کہ اگر دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔ تاہم حالت امن میں بھی یہ صورت حال کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ اس طرح پاکستان مستقل طور پر بھارتی جارحیت کے سامنے غیر محفوظ ہو کر رہ جاتا پاکستان کا تصور جو ہم نے قائم کیا تھا وہ یہ نہیں تھا۔

اقتصادی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو یہ صورت حال ہمارے لئے قابل قبول نہیں کیونکہ ہماری بیشتر زراعت دریاؤں کے پانی کی مرہون منت ہے اور پاکستانی میدانوں کو سیراب کرنے والے تمام دریا ماسوائے دریائے سندھ کے، کشمیر سے بہہ کر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ منگلا ہیڈورکس تو کشمیر کی حدود ہی میں ہے جبکہ مرالہ ہیڈ ورکس کشمیر کی سرحد سے محض ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ اسی طرح ریاست کشمیر کی اقتصادیات بھی انہی علاقوں سے وابستہ ہے کیونکہ سارا سال کھلا رہنے والا وہ راستہ جو کشمیر کو برصغیر سے ملاتا ہے کوہالہ اور مظفر آباد ہی کے ذریعے پنجاب کو ملاتا ہے اور اسی طرح کشمیر کی آمدنی کا اہم وسیلہ، عمارتی لکڑی بھی دریائے جہلم کے راستے سے ہی پنجاب کے میدانوں میں آتی ہے لہٰذا یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ کشمیر اور پاکستان یا پاکستان اور کشمیر ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔

مندرجہ بالا حالات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر کا پاکستان کے ساتھ

الحاق صرف خواہشات ہی کی بنا پر ضروری نہیں بلکہ کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہماری سلامتی کے علاوہ کشمیر کی اسی فیصد آبادی یہ چاہتی ہے کہ کشمیر پاکستان میں شامل ہو مگر یہ سب کچھ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کشمیری عوام کو ان کی خواہشات کے مطابق فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے اور اگر کشمیری مسلمانوں کو مار مار کر ریاست سے جلاوطن کر دیا جائے اور جو باقی بچیں انہیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے تو یہ ایک الگ المیہ ہو گا۔

میرا ذہن ان دنوں بیشتر دیگر پاکستانیوں کی طرح انہی خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا جب کسی نے میرا تعارف سردار محمد ابراہیم سے کروایا۔ سردار محمد ابراہیم جو بعد میں آزاد کشمیر کے صدر بھی منتخب ہوئے پاکستان میں غیر معروف شخصیت تھے۔ کیونکہ بیشتر کشمیری رہنما جو ریاست کا الحاق پاکستان سے چاہتے تھے کشمیری مہاراجہ کی جیلوں میں بند تھے۔ سردار محمد ابراہیم خفیہ طور پر ریاست کی سرحد عبور کر کے پاکستان میں داخل ہوئے تھے اور پاکستان میں کشمیریوں کی مدد کیلئے مختلف نمائندین اور گروہوں سے تعاون کے لئے مذاکرات کی کوشش کر رہے تھے۔ سردار محمد ابراہیم نے بتایا کہ پوری ریاست کشمیر میں کشمیری مسلمانوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے اور وہ مہاراجہ کی طرف سے نہ صرف مایوس ہو چکے ہیں بلکہ انہیں خطرہ ہے کہ مہاراجہ کشمیر ریاست کو بھارت کے حوالے کرنے کا ارادہ کر چکا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ریاست کشمیر میں ایسی ہر آواز کو سختی سے کچلا جا رہا ہے جو ریاست کو پاکستان کے ساتھ شامل ہونے کے حق میں اٹھتی ہے۔ بقول ان کے اب مذاکرات کا وقت گزر چکا تھا اور کشمیری مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ مسلح جدوجہد کے ذریعے اپنے مقصد کو حاصل کریں اور اس کے لئے ریاست کے تمام مسلمان ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں انہوں نے بتایا کہ فی الحال انہیں پانچ سو رائفلیں مہیا کر دی جائیں اور ان رائفلوں کو ریاست کے اندر لے جانے میں تعاون کیا جائے تو وہ کافی حد تک اس مسئلہ کو بغیر کسی بیرونی تعاون کے نپٹانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک انتہائی معمولی مطالبہ تھا جب کہ اس کے مقابلے میں وہ مقصد بہت بڑا تھا جس کے لئے یہ درخواست کی گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان دنوں پانچ سو رائفلیں فراہم کرنا بھی آسان کام نہ تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا حکومت پاکستان کو خود اس میں براہ راست سرکاری طور پر حصہ لینا چاہئے یا حکومت پاکستان اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لینے پر آمادہ ہو گی مگر انہی دنوں میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ حکومت پاکستان اس سلسلہ میں خود بھی ایک فیصلہ

کر چکی ہے۔

انہی دنوں میاں افتخار الدین جو کہ نہ صرف مسلم لیگ کے معروف رہنما تھے بلکہ پاکستان میں حکمران جماعت کے اہم عہدیدار بھی تھے' مری تشریف لائے انہوں نے بتایا کہ وہ ایک ہفتہ عشرہ کے لئے سرینگر جا رہے ہیں کیونکہ حکومت پاکستان نے انہیں یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ سرینگر جا کر کشمیری رہنماؤں سے ملاقات کریں اور اس امر کا بھی جائزہ لیں کہ ریاست کشمیر کو پاکستان میں شامل کرنے میں کیا دشواریاں حائل ہیں کشمیری رہنماؤں کو اس امر کی یقین دہانی کرانا بھی ان کے فرائض میں شامل تھا کہ ان کی جدوجہد میں مکمل تعاون کیا جائے گا اور اگر حالات دوسرا رخ اختیار کرنے والے ہوں تو وہاں کے حالات کی روشنی میں ایسا منصوبہ وضع کیا جائے جس پر عمل کر کے کشمیر کو بھارت کے چنگل میں جانے سے روکا جا سکے انہوں نے مجھ سے بھی اس سلسلہ میں تعاون کیلئے کہا کیونکہ ان کا خیال تھا وہ سری نگر سے کامیاب واپس آئیں گے۔

جب اس امر کا اشارہ مل گیا کہ کشمیر کو پاکستان میں شامل کرنے کے لئے پاکستان مسلم لیگ بھی متحرک ہو چکی ہے تو یہ بات کافی حد تک حوصلہ افزا تھی مگر میاں افتخار الدین نے اس امر کی وضاحت نہیں کی تھی کہ وہ کس حد تک اس منصوبے میں آگے جا سکتے ہیں بلکہ انہوں نے یہ بھی واضح طور پر بتا دیا تھا کہ مسلم لیگ اس منصوبے کی تکمیل کے لئے کچھ رقم فراہم کر سکتی ہے اور یہ رقم بھی کوئی بہت بڑی نہیں ہو گی اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہمیں یہ بھی واضح کر دیا کہ جو بھی افسر یا جوان اس مہم میں شامل ہوں گے ان کی طرف سے اس منصوبے میں شمولیت قطعی غیر سرکاری ہو گی اور براہ راست حکومت پاکستان اس کی ذمہ داری قبول نہیں کرے گی۔ میں نے ان تمام حالات سے سردار محمد ابراہیم کو آگاہ کیا ان سے کچھ صلاح مشورے کئے اور واپس راولپنڈی آ گیا تاکہ اس مہم کی تیاری کے علاوہ اس کی منصوبہ بندی بھی کی جا سکے۔

اس منصوبے پر عمل درآمد کے لئے ہمیں جو اسلحہ درکار تھا اس میں سرفہرست رائفلوں کا حصول تھا۔ ان دنوں میں جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں اسلحہ ہی کا ڈائریکٹر تھا۔ مجھ سے کوئی بات ڈھکی چھپی نہ تھی اس لئے سوال یہ نہیں تھا کہ ہمیں کتنی رائفلیں درکار ہوں گی بلکہ سوال یہ تھا کہ ہمیں کس طرح رائفلیں دستیاب ہوں گی کیونکہ پاکستان کی تشکیل کے بعد جو اسلحہ پاکستان کے حصہ میں آیا تھا اس کا بیشتر حصہ تاحال بھارت میں پڑا ہوا تھا اس کے علاوہ حکومت پاکستان اس مہم کے لئے کسی قسم کا اسلحہ فراہم کرنے کی

پوزیشن میں نہ تھی- بہت زیادہ غور و خوض اور چھان پھٹک کے بعد ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ چار ہزار رائفلیں جی ایچ کیو میں ایسی موجود ہیں جو پنجاب پولیس کے لئے تھیں ان کے حصول کے لئے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تھا اور یہ ذخیرہ جی ایچ کیو ہی میں محفوظ تھا- اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ آرمی آرڈیننس ڈپو اسلحہ کی بہت بڑی تعداد کو سمندر برد کرنے والا ہے میں نے آرڈیننس کے کرنل اعظم خان سے بات کی اور اسے اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ یہ ذخیرہ خفیہ طور پر ہمارے حوالہ کر دے گا اور کاغذات میں یہی تحریر کیا جائے گا کہ اسے کراچی منتقل کر کے سمندر میں ڈبو دیا گیا ہے- یہی نہیں بلکہ ہم نے پنجاب پولیس کی طرف سے خود ہی ایک دستاویز تیار کی جس میں چار ہزار رائفلوں کا مطالبہ کر کے وہ رائفلیں اپنے لئے حاصل کر لیں-

اس امر کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا تھا کہ پاکستان آرمی سے کسی افسر یا جوان کو نہ لیا جائے حالانکہ اس مہم میں ہمیں انتہائی تربیت یافتہ لوگوں کی ضرورت تھی جو باہم رابطے کے علاوہ اس مہم میں بھی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں اس مقصد کے لئے انڈین نیشنل آرمی کے ان سابقہ افسروں اور جوانوں سے رابطہ قائم کیا جو ہمارے لئے کار آمد ہو سکنے کے علاوہ قابل اعتماد بھی تھے-

چونکہ اس مہم کو انتہائی خفیہ رکھنا تھا لہٰذا اس امر میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی کہ اس مہم میں جو تیکنیکی تجربہ اور آلات ہمیں درکار ہوں گے انہیں کیسے حاصل کیا جائے کیونکہ ہمیں اپنی ان تمام سرگرمیوں کو اس لئے بھی خفیہ رکھنا تھا کہ ہمارے کمانڈر ان چیف کو اس سلسلے میں کوئی بھنک نہ پڑ جائے یہی وجہ تھی کہ ایسے تقریباً بیس (۲۰) آفیسروں سے بھی اس مہم کو خفیہ رکھا گیا جو مجھ سے زیادہ تجربے کار یا فوجی زبان میں مجھ سے سینئر تھے کیونکہ یہ خدشہ اپنی جگہ بدرجہ اتم موجود تھا کہ آفیسروں میں مجھ سے ذاتی اختلافات یا آپس کی سازشیں اس مہم کو متاثر کر دیں لہٰذا مجھے ہر طرف سے ہوشیار رہ کر انتہائی رازداری سے اپنے کام کو مکمل کرنا تھا-

میں نے اس مہم کے لئے ایک تفصیلی منصوبہ مرتب کیا جسے "کشمیر میں مسلح بغاوت" کا نام دیا گیا- یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ حکومت پاکستان کسی بھی موقع پر اس امر کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی کہ اس پر کشمیر میں براہ راست مداخلت کا الزام آئے اس لئے ہماری حکمت عملی یہی تھی کہ ایک طرف تو کشمیر کے اندر کشمیری مسلمانوں کو مسلح کیا جائے اور دوسری طرف کشمیر میں داخل ہونے والے ان بھارتی مسلح افراد کو روکا جائے جو کسی بھی

طرح سے کشمیری مسلمانوں کے خلاف مہاراجہ کا ساتھ دینے والے ہوں اس کے ساتھ ہی اس امر پر بھی توجہ دی گئی کہ مہاراجہ کی اس فوج سے جو نو ہزار افراد پر مشتمل تھی، کس طرح سے نبٹا جائے۔ ہمارے خیال میں نو ہزار میں سے دو ہزار افراد ایسے تھے جو مسلمان تھے اور جن کے بارے میں ہمارا خیال یہ تھا کہ وہ کشمیری مسلمانوں پر جبر کرنے میں یقیناً ہچکچائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ وہ مسلمان تھے اس لئے کشمیری مسلمانوں پر جبر نہیں کریں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کشمیری فوج کو چھوڑ کر کشمیری باغیوں سے جا ملیں جہاں تک ان سات ہزار ریاستی فوجیوں کا تعلق تھا اگر کشمیری مسلمانوں کو مسلح کر دیا جائے تو ان سات ہزار فوجیوں سے نبٹنا کشمیری مسلمانوں کے لئے مشکل مسئلہ نہ ہو گا۔ ہمیں سب سے زیادہ توجہ اس امر پر مرکوز رکھنی تھی کہ مہاراجہ کو بھارت کی طرف سے کسی قسم کی فوجی مدد نہ مل سکے اور اس کے لئے ہمیں ان راستوں کو بند کرنا تھا یا کاٹنا تھا جن راستوں سے بھارتی مسلح افواج یا ان کا کچھ حصہ کشمیر میں داخل ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں کٹھوعہ سے جموں تک کا راستہ گو پختہ سڑک نہیں ہے تاہم آمدورفت کے لئے خاصہ مددگار ہو سکتا تھا اور اسی طرح چھوٹے چھوٹے راستے جو پہاڑیوں اور وادی کے میدانوں سے ہو کر نیچے کی طرف جاتے ہیں ہماری کوشش یہی تھی ان پر چھاپہ مار بٹھا دیئے جائیں جو مسلح افراد کے قافلوں کو ریاست میں داخل ہونے سے روکیں۔ بلاشبہ کسی بہت بڑی تعداد کو روکنا ان چھاپہ ماروں کے بس کی بات نہ تھی مگر ان راستوں کی نوعیت اور جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر چند چھاپہ مار بھی بہت بڑی تعداد کو خاصی دیر تک روک سکتے تھے اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے تھے کہ ایک ماہ بعد بارشیں ہونے والی ہیں اور یہ علاقہ کیچڑ کی وجہ سے کافی حد تک ناقابل عبور بن جاتا ہے جبکہ سردیوں کے موسم میں برفباری ان راستوں کو کافی حد تک بند کرنے کا موجب بن جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ تمام امکانات ہم نے یہ سوچ کر نظر میں رکھے تھے کہ بھارت کی طرف سے کشمیری مہاراجہ کی مدد کے لئے مسلح کمک آ سکتی ہے۔ حالانکہ ہمیں اس سلسلے میں بھی کچھ معلومات حاصل ہوئی تھیں کہ بھارتی فوج فی الحال ریاست کشمیر میں داخل ہونے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ جہاں تک ہوائی راستوں سے کشمیر میں بھارتی مسلح فوج بھیجنے کا تعلق تھا اس کے لئے ایک ہی جگہ تھی جہاں یہ ہوائی جہاز اتر سکتے تھے اور یہ جگہ سرینگر شہر سے چند میل باہر ایسے مقام پر واقعہ تھی جہاں ان کے تحفظ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ معمولی تعداد میں مسلح چھاپہ مار یا باغی کشمیری مسلمان نہ صرف ان جہازوں کو زمین پر اترنے سے روک سکتے تھے بلکہ اگر کوئی فوجی اتر بھی چکے ہوں تو ان کا

صفایا آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔ وہ چار ہزار رائفلیں جو ہمیں دستیاب تھیں ان میں سے ایک ہزار رائفلیں ایسے افراد کو فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو جموں کٹھولہ روڈ پر متعین ہوں گے اور دو سو رائفلیں ان افراد کے لئے جنہیں سرینگر سے باہر ہوائی اڈہ کی گراونڈ پر اپنے فرائض سرانجام دینے تھے جبکہ دو ہزار آٹھ سو رائفلیں پاکستان کے ساتھ ساتھ کشمیر کی سرحد کے علاقوں میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

جب میاں افتخار الدین سرینگر سے واپس آئے تو میں نے اپنے ترتیب دیئے ہوئے منصوبوں کی درجن بھر کاپیاں ان کے حوالے کیں اس کے چند روز بعد مجھے لاہور بلایا گیا جہاں میری ملاقات پاکستان کے وزیراعظم خان لیاقت علی خاں سے طے کی تھی لاہور پہنچنے پر میری ابتدائی میٹنگ سردار شوکت حیات اور ان کے رفقا سے ہوئی۔ یہ اجلاس حکومت پنجاب کی سیکرٹریٹ میں رکھا گیا تھا کیونکہ سردار شوکت حیات ان دنوں پنجاب کی صوبائی کابینہ کے اہم وزیر بھی تھے۔

اس اجلاس میں وہ نظم و نسق تو موجود نہ تھا جس کے ہم فوجی عادی ہوتے ہیں مگر ایک بات ظاہر تھی کہ میرے منصوبے کو خاصی پذیرائی حاصل ہو چکی ہے اجلاس میں ہر شخص انتہائی گرم جوشی سے اس مہم کے بارے میں حصہ لے رہا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہمارے عمائدین انتہائی سنجیدگی سے منصوبہ کے ہم خیال ہیں اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے خود بھی ایک خاکہ تیار کیا ہوا تھا۔ گو کہ اس اجلاس میں میری موجودگی غیرمتوقع تھی مگر مجھے اس لئے بھی اس اجلاس میں غیرشناسائی کا احساس نہ ہوا کہ بیشتر لوگ مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے اور سردار شوکت حیات تو خود اس منصوبے کے روح رواں تھے جبکہ بیشتر شرکاء کے ہاتھوں میں میرے منصوبے کی کاپیاں موجود تھیں مگر مجھے شبہ تھا کہ انہوں نے شاید ہی اس منصوبے پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارہ کی ہے۔

اس منصوبے کی بنیادی اہمیت یہ تھی کہ اس میں سابقہ انڈین نیشنل آرمی کے آفیسروں اور جوانوں کو حصہ لینا تھا جس کی کمان زمان کیانی کے ہاتھ میں تھی ان لوگوں کو پنجاب کی سرحد سے کشمیر کے اندر داخل ہونا تھا اور دوسری طرف راولپنڈی کے شمال میں نیشنل گارڈ کے ان جوانوں کو حصہ لینا تھا جن کی سربراہی خورشید انور کے ہاتھ میں تھی جو پاکستان مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے کمانڈر تھے اور ان دونوں سیکٹروں میں ہونے والی کارروائیاں براہ راست سردار شوکت حیات کی زیر نگرانی ہونا قرار پائیں۔

اس منصوبے پر بحث و تمحیص کے دوران میں نے جموں کٹھوہر روڈ پر جوانوں کی تعیناتی

پر زور دیا اور سرینگر سے باہر ہوائی اڈے کی اہمیت پر بھی زور ڈالا جسے انہوں نے بخوشی قبول کر لیا اور جب میں نے یہ بتایا کہ چار ہزار رائفلوں کا انتظام ہو گیا ہے تو انہوں نے انتہائی گرم جوشی کے ساتھ مجھے مبارک باد دی اور شام چھ بجے وزیراعظم سے ملاقات کے لئے گورنر ہاؤس پہنچنے کو کہا۔

اس اجلاس میں وزیراعظم کے علاوہ جن دیگر افراد نے حصہ لیا ان میں سیکرٹری فنانس غلام محمد جو بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بھی بنے میاں افتخار الدین' زمان کیانی' خورشید انور' سردار شوکت حیات خان اور میں خود شامل تھا۔ اس اجلاس میں بھی صبح کے اجلاس کی طرح منصوبہ کے فوجی نکات پر کم بحث کی گئی' البتہ مالی وسائل کی فراہمی پر بہت زیادہ توجہ دی گئی۔ وزیراعظم نے مجھ سے سوالات کے ذریعے یہ معلوم کیا کہ میں کیا کچھ کر سکتا ہوں اور جب میں نے انہیں بتایا کہ میں کیا کچھ انتظام کر چکا ہوں اور مزید کیا کر سکتا ہوں تو وہ خاصے مطمئن ہوئے تاہم اجلاس کے شرکاء کی گرمجوشی اس بات کی مظہر تھی کہ یہ لوگ مسئلے کو سنجیدگی سے اہمیت دے رہے ہیں اور چونکہ وہ خود فوجی نہیں ہیں اس لئے بہت سی ایسی باتیں وہ یا تو جان بوجھ کر نہیں پوچھ رہے تھے یا میری آمد سے قبل ہی وہ ان پر غور و خوض کر چکے تھے' اس اجلاس میں جو جوش و خروش اور جذبہ دیکھنے میں آیا وہ بلاشبہ ان کے خلوص کا آئینہ دار تھا مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ درست ہے کہ گو یہ تلخ حقیقت ہے کہ اجلاس کے شرکاء میں سے کوئی بھی اس قسم کی فوجی مہم کے سلسلے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی ان میں کوئی جاننے کا متردد تھا۔

جب میں اجلاس سے باہر آیا تو خورشید انور مجھے ایک طرف لے گئے اور بتایا کہ وہ کسی بھی صورت میں سردار شوکت حیات خان کے ماتحت کام نہیں کرنا چاہتے اور سردار شوکت حیات کا کوئی بھی حکم نہیں مانیں گے۔ میں نے خورشید انور کو موقع کی نزاکت سے آگاہ کرتے ہوئے ہموار کرنے کی بہت کوشش کی۔ ایسے حالات میں ذاتی پرخاش یا غرور کی اہمیت نہیں ہونی چاہئے بلکہ مل جل کے کام کرنا چاہئے مگر وہ کسی صورت بھی سردار شوکت حیات کے ماتحت کام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تھوڑی دیر بعد سردار شوکت حیات خان باہر آئے تو انہوں نے بھی مجھے بتایا کہ وہ خورشید انور پر اعتماد نہیں کرتے۔ میں نے سردار شوکت حیات کو یہ کہا کہ خورشید انور کی جگہ کسی دوسرے شخص کو لے لیا جائے تو سردار شوکت حیات نے بتایا کہ خورشید انور اوپر والوں کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے لہٰذا میں اسے نہ تو ہٹا سکتا ہوں' نہ تبدیل کر سکتا ہوں' میں اس پر اعتماد نہیں کر سکتا۔

میرے لئے یہ خیال سوہان روح تھا کہ ابتدا ہی میں ذاتی چپقلشوں کی بنا پر اس مہم میں وہ ربط نہیں ہو رہا تھا جو کسی منصوبے کی تکمیل کے لئے ازبس ضروری ہوتا ہے اور اس طرح مرکزی احکامات کیلئے بعض شخصیتیں خودسری پر آمادہ ہیں، تاہم میں نے اپنے آپ کو یہ سوچ کر تسلی دی کہ جیسے جیسے یہ منصوبہ روبہ عمل ہو گا ایسی تمام رکاوٹیں خود بخود دور ہوتی جائیں گی۔ ہم نے سو سال کے بعد برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کی ہے اور اب برصغیر کے مسلمانوں نے ایک الگ خطہ وطن حاصل کر لیا ہے تو دیگر مراحل بھی بتدریج حل ہوتے جائیں گے۔ ایک ماہ کے اندر ہی کشمیر میں مسلمانوں کی بغاوت بلکہ جنگ آزادی نے زور پکڑ لیا جس کی صدائے بازگشت پوری دنیا اور پاکستان میں خصوصی طور پر سنی گئی۔ پورے پاکستان میں کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو کامیاب بنانے کے لئے ہر طبقہ اور ہر مکتب فکر نے ہر طرح کی قربانی دینے کے عزم کا اظہار کیا۔ کشمیریوں کی اس جنگ آزادی کے جواب میں ریاستی فوج اور اس کے معاون مسلح بھارتی مداخلت کاروں نے کشمیریوں کو جبر و تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ آگ اور خون کی اس ہولی نے جو ریاست کشمیر میں کھیلی جا رہی تھی۔ پاکستان میں مسلمانوں کو بے چین کر دیا وہ اپنے کشمیری بھائیوں کے خون کی خوشبو محسوس کرتے ہوئے سڑکوں پر آ گئے اور ہر طرف یہ شور اور مطالبہ ہونے لگا کہ کشمیری مسلمانوں کو ڈوگرا سامراج سے نجات دلائی جائے۔

باب ۴

قبائلی حملہ

وزیراعظم سے کانفرنس کے بعد میں راولپنڈی واپس آگیا' پہلا فائر ہو چکا تھا اور اب مہم زور پکڑنے والی تھی۔

کشمیر کے معاملہ میں اس مرحلہ پر میری کوئی ذمہ داری نہیں تھی مگر میں نے وعدہ کیا تھا کہ ذاتی طور پر میں جو مدد بھی کر سکا' کروں گا' جی ایچ کیو میں میں نے بریگیڈیئر شیر خان کو اعتماد میں لیا وہ ڈائریکٹر انٹیلی جنس تھے' ان کی مدد سے میں اس قابل ہوا کہ فوجی ذرائع سے حاصل ہونے والی اطلاعات سے باخبر رہ سکوں۔

کیولری کے لیفٹیننٹ کرنل مسعود نے (بعد میں بریگیڈیئر ٹامی مسعود) متروک گولہ بارود حاصل کرنے اور ان کا ذخیرہ کرنے میں مدد کی پیشکش کی جسے بعد میں زمان کیانی اور خورشید انور کی تحویل میں دیا گیا۔ پاکستان کی ایئرفورس کے کمانڈر جنجوعہ اور اس کے رفقاء نے رضاکاروں کے لئے موسم سرما کی وردیوں کے علاوہ اسلحہ بھی فراہم کیا۔ راولپنڈی کے کمشنر راجہ عبدالرحیم کی خدمات بھی یادگار ہیں جو انہوں نے انتہائی گرم جوشی کے ساتھ چندہ' اسلحہ' راشن حتیٰ کہ رضاکار تک فراہم کر کے سرانجام دیئے۔ انہی کے گھر میں میری ملاقات سردار شوکت حیات اور ان دوسرے رہنماؤں سے ہوئی جب وہ اس مہم کے سلسلے میں راولپنڈی آئے۔

وہ چار ہزار رائفلیں جو بظاہر پولیس کو جانی تھیں مگر درحقیقت ہماری مہم میں استعمال ہونے والی تھیں' ان کے حصول کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ چار ہزار رائفلیں جو فوجی اسلحہ خانے سے نکالی گئیں' ان لوگوں تک نہ پہنچیں جنہیں پہنچانا مقصود تھا' بلکہ ان فوجی رائفلوں کی جگہ ایسی چار ہزار رائفلیں تھما دی گئیں جو سرحد کے قبائلی علاقے کی بنی ہوئی تھیں بظاہر یہ رائفلیں ویسی ہی تھیں جیسی فوجی اسلحہ خانے سے دی جانے والی رائفلیں' مگر ان رائفلوں کی نالی فوجی رائفل کے مقابلے میں بہت ناقص ہوتی تھی جو تھوڑے ہی استعمال کے بعد پھٹ جاتی تھی۔ سرحد کی بنی ہوئی

رائفلوں کے متعلق یہ مشہور تھا کہ یہ رائفلیں اس وقت صرف سو روپے میں مل جاتی تھیں۔ خود قبائلی یا سرحد کے لوگ فوجی رائفل ایک ہزار روپے میں خریدتے تھے۔ ظاہر ہے' ایسی رائفلیں دیرپا نہیں ہوتی تھیں اور نہ ہی ان کی مرمت کی جا سکتی تھی' لہٰذا جو رضاکار یا مہم جو ان رائفلوں کے سہارے جنگ لڑنے گئے ان کی کارکردگی کیا رہ گئی ہو گی۔

وزیراعظم نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ بیرونی ممالک سے کچھ لائٹ مشین گنیں بھی منگوائیں گے اور اس مقصد کے لئے ایک معقول رقم کی ادائیگی بھی کر دی گئی اور کہا یہ گیا کہ یہ مشین گنیں اٹلی میں موجود دوسری جنگ عظیم کے متروکہ ذخیروں سے منگوائی جا رہی ہیں مگر حیرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ جب وہ لائٹ مشین گنیں جن کو برین گن کہا جاتا ہے یہاں پہنچیں تو وہ اٹلی کی بنی ہوئی سٹین گنوں میں تبدیل ہو چکی تھیں جن کا ہدف زیادہ سے زیادہ دو سو گز تھا' ظاہر ہے یہ سٹین گنیں ہماری مہم میں بے کار تھیں اور یہ پیسہ بھی ضائع کیا گیا۔

اسی دوران بھارتی حکومت نے بھی ریاست کشمیر میں نہ صرف اپنی دلچسپی کا اظہار کرنا شروع کر دیا بلکہ اپنے آپ کو ایک فریق کے طور پر ظاہر کرتے ہوئے پاکستان پر الزام عائد کیا کہ پاکستان معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی اقتصادی دباؤ کے طور پر بہت سی اشیاء جن میں اشیاء خوردنی مٹی کا تیل شامل تھا ان کے رسل و رسائل میں رکاوٹ ڈالنی شروع کر دی بلکہ اکثر اوقات ان کی ترسیل یکسر معطل کر دی۔ پٹرول پر پابندی کے علاوہ سیالکوٹ اور جموں کے پاس ریلوے سروس بھی منقطع کر دی ہے۔

پاکستان کے وزیر خارجہ نے اس کے جواب میں کہا کہ چونکہ کشمیر میں حالات غیریقینی ہیں اور لاریوں کے ڈرائیوروں نے پنڈی سے آگے جانے سے انکار کر دیا ہے اور چونکہ اس روڈ پر چلنے والی گاڑیاں نجی مالکان کی ہیں اس لئے حکومت اس معاملہ میں کچھ کرنے سے قاصر ہے' بھارت کا کہنا تھا کہ پاکستان نے رسل و رسائل ہی کو منقطع نہیں کیا بلکہ پوری سرحد کے ساتھ حملے شروع کر دیئے ہیں اور مسلح جتھوں کو اس کی کھلی چھٹی دے دی ہے کہ وہ کشمیر میں داخل ہو جائیں' شیخ عبداللہ نے اس میں سے کافی کچھ کی تردید کر دی وہ ان دنوں بھارت نواز مسلمان کشمیری لیڈر تھے۔ ۲۱ اکتوبر کو دہلی میں جاری ہونے والے ایک اخباری بیان میں جو ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا نے اخبارات کے دفاتر میں بھیجا' انہوں نے کہا:

"پٹیالہ' بھرت پور اور بعض دوسری ریاستوں میں رونما ہونے والے واقعات نے

کشمیری مسلمانوں کے دلوں میں' جن کی ریاست میں اکثریت ہے' شکوک پیدا کر دیئے ہیں' انہیں خطرہ ہے کہ بھارت کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے نتیجہ میں وہ خطرات سے دوچار ہو جائیں گے"

شیخ عبداللہ نے کہا: پونچھ میں موجودہ ہنگاموں کی وجہ ریاستی حکمران کی غیردانشمندانہ پالیسی ہے۔ پونچھ کے عوام اپنے مقامی حکمران اور اس کے بعد کشمیری حکمران کے ظلم سہہ رہے ہیں۔ لوگوں نے اپنی مشکلات کے ازالہ کیلئے تحریک شروع کر دی ہے جو فرقہ وارانہ نہیں۔ ریاست کشمیر نے وہاں فوج بھیج دی جس کے باعث پونچھ میں افراتفری ہے مگر پونچھ کی ساری بالغ آبادی سابق فوجیوں پر مشتمل ہے جنہوں نے انڈین آرمی میں ملازمت کی تھی ان کے رشتہ دار جہلم اور راولپنڈی میں ہیں وہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر سرحد عبور کر گئے اور مسلح ہو کر واپس آئے ہیں اب صورتحال یہ ہے کہ ریاستی فوج کو کئی مقامات پر پسپا ہونا پڑا ہے"

اس طرح اکتوبر کے تیسرے ہفتہ تک کشمیر میں رونما ہونے والے واقعات کلیتاً" اندرونی شورش کے تھے جو آہستہ آہستہ زور پکڑ رہے تھے اور اس کے نتیجہ میں زیادہ سے زیادہ علاقے مہاراجہ کے کنٹرول سے باہر ہوتے جا رہے تھے' شیخ عبداللہ بھی مہاراجہ کو صورتحال کی خرابی کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے جس سے صاف ظاہر ہے کہ موخر الذکر کے پاس بھارتی امداد حاصل کرنے کی کوئی حقیقی وجہ موجود نہ تھی مگر اس مرحلہ پر اچانک کشمیر میں ۲۲ اکتوبر کو قبائلیوں کے داخلہ سے صورتحال تبدیل ہو گئی' یہ اس درجہ اہم واقعہ تھا کہ چار روز کے اندر کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق ہو گیا۔

میں صراحت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ قبائلیوں کے اس طرح حملہ کرنے کا فیصلہ کب ہوا تھا' تاہم میں یہ ضرور سنتا تھا کہ خورشید انور قبائلیوں کا لشکر جمع کر رہا ہے' قبائلیوں کے حملہ کے وقت بھارت کو بھی ہماری جانب سے اطلاع مل گئی تھی "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" کے مطابق' کمانڈر ان چیف انڈیا کو جی ایچ کیو پاکستان آرمی کی جانب سے ۲۰ اکتوبر کو ایک ٹیلیگرام ملا جس میں بتایا گیا تھا کہ ۵۰۰۰ کے لگ بھگ قبائلیوں نے مظفر آباد اور ڈومیل پر حملہ کر کے انہیں قبضہ میں لے لیا ہے۔

بھارت کی تازہ دم فوج کے ساتھ سرحدی قبائلیوں کا پہلے بیان کئے دونوں راستوں پر بڑا تصادم ناگزیر تھا یعنی کٹھوعہ روڈ اور سری نگر کی لینڈنگ گراؤنڈ پر' میں نے فوری طور پر اپنے آدمیوں سے رابطہ کر کے پتہ کیا کہ جن افراد کے لئے رائفلیں حاصل کی گئی تھیں وہ

اپنے مقامات پر موجود ہیں جس پر مجھے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ ان کی دیسی ساخت کی رائفلیں ٹوٹ چکی تھیں اور وہ گھروں کو چلے گئے ہیں' سری نگر لینڈنگ گراونڈ کیلئے جو دو سو رائفلیں ملنے والی تھیں وہ متعلقہ لوگوں کو خورشید انور نے دی ہی نہیں' خواجہ رحیم کی مدد سے میں نے فوری طور پر ایک سو سابق فوجی رضاکاروں کو پنڈی سے جہلم کے پار اور مسلم لیگ نیشنل گارڈ افسر لطیف افغانی کی زیر کمان پہاڑیوں میں روانہ کیا' وہ لوگ فوری طور پر وہاں پہنچ گئے۔ تاہم ان میں تیس کا جانی نقصان ہوا مگر وہ اس وقت ایسی پوزیشن میں نہ تھے کہ بھارتی فوج کو جو پہلے ہی دفاعی پوزیشن اختیار کر چکی تھی' اترنے سے روک سکتے۔

قبائلی حملہ کامیابی کے اعتبار سے دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا۔ ایک فوجی کی حیثیت سے میں ان کی اس کامیابی کا تصور نہیں کر سکتا تھا' یہ سچ ہے کہ مظفر آباد میں مسلمان فوجیوں کے تتر بتر ہو جانے پر ان کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ ڈوگرہ فوج نے بے حوصلہ ہو جانے پر اتنی مزاحمت نہیں کی تھی جس کی توقع کی جا رہی تھی' اس کے باوجود قبائلیوں نے لڑائی کے دوران جو داؤ پیچ اختیار کئے ان کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی' بظاہر وہ سول لاریوں کے قافلوں میں سوار ہو کر آئے تھے ان کے پاس صرف ان کی اپنی بندوقیں تھیں غالباً ان کی تعداد شروع میں دو ہزار تھی تاہم میں وثوق کے ساتھ ان کی تعداد کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا' ایسا دکھائی دیتا ہے کہ کسی ایک وقت پر ان میں سے ایک چوتھائی نے بھی لڑائی میں حصہ لیا ہو گا۔ ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ لاریوں میں سوار ہو کر آگے بڑھتے اور اس وقت تک لاریوں میں ہی سفر کرتے جب تک سامنے مزاحمت نہ آ جاتی محسوس ہوتا ہے کہ ریاستی فوج ان سے خوفزدہ تھی اور وہ آخر وقت تک ان سے نبرد آزما کبھی نہ ہوئے بلکہ جونہی ان کا کوئی جانی نقصان ہوتا وہ پیچھے دوسرے مورچے میں چلے جاتے جہاں ان کا پیچھا کیا جاتا اور وہ پھر پیچھے ہٹ جاتے۔

قبائلی حملہ کے ساتھ' تیسرے روز دہلی میں بھارتی فوجی سربراہوں کو مہاراجہ کی اپیل کے متوقع جواب میں فوجیں بھیجنے کیلئے احکامات دیئے گئے اور اس شام تین شاف افسر بذریعہ طیارہ سری نگر پہنچے۔ اگلی صبح جب قبائلیوں نے بارہ مولہ پر قبضہ کیا جو سری نگر سے پینتیس میل پر ہے' مہاراجہ نے فیصلہ کیا کہ اب مزید بکواس نہیں ہونی چاہیے' یہ نہیں کہ وہ محاذ پر پہنچ گیا بلکہ اس نے بوریا بستر سنبھالا اور دارالحکومت سے نکل گیا۔ رات کو جموں پہنچ کر' دو سو میل دور بھی' وہ ڈر سے کانپ رہا تھا۔ سونے سے پہلے اس نے اپنے اے ڈی سی سے کہا کہ صبح ہوتے ہی اگر بھارت سے وی پی مینن مدد لے کر نہ آیا تو اس کا یہ مطلب ہو گا

کہ سب کچھ ختم ہو گیا ایسی صورت میں وہ (اے ڈی سی) مہاراجہ کو گولی مار کر سوتے میں موت کی نیند سلا دے۔

گولی کھا کر موت کی نیند سونا مہاراجہ کا مقدر نہ تھا کیونکہ اس وقت بھارت کے ایک سو طیاروں کو اگلے روز فوج لے کر کشمیر میں اترنے کیلئے تیار کیا جا رہا تھا۔

دریں اثناء پورے برصغیر میں شدید بے چینی پیدا ہو گئی تھی حتیٰ کہ دور' ایک اور ریاست حیدر آباد دکن میں' جس نے ابھی تک الحاق کا فیصلہ نہیں کیا تھا اسی رات تین بجے بیس سے تیس ہزار مسلمانوں نے ان مندوبین کے گھروں کا محاصرہ کر لیا جو ریاست کے الحاق کے سلسلہ میں نئی دہلی روانہ ہونے والے تھے' پاکستان میں ہر کوئی اشتیاق کے ساتھ قبائلیوں کی پیش قدمی کی باتیں کر رہا تھا اور کسی کو ابھی یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ مہاراجہ نے ضروری دستاویزات پر دستخط کر کے آخرکار بھارت سے الحاق کر لیا ہے۔

باب ۵

بھارت کی مداخلت

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی صبح پاکستان کے طول و عرض میں لوگوں نے ریڈیو پر کشمیر کے الحاق اور بھارتی مداخلت کی خبر سنی یہ غم انگیز خبر تھی کیونکہ اس سے پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات میں مزید بگاڑ کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اس کا مطلب تھا حالات مزید خراب ہوں گے' پہلے ہی حالات بگڑے ہوئے تھے اور لاکھوں مہاجرین نے راہ میں بڑی صعوبتوں کا سامنا کیا تھا۔ بھارت نے ہمارے فوجی سٹورز پر قبضہ کر لیا تھا اور ایک دوسری ریاست جونا گڑھ پر جس نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا تھا' بھارت قبضہ کر چکا تھا بہت سے لوگوں کو امید تھی کہ اب ایسا کچھ نہیں ہو گا اور بالاخر کشمیر کے معاملہ میں بھارت عقل سے کام لے گا اور ریاست میں ہونے والی بغاوت سے ریاست کے مستقبل کے منصفانہ تصفیہ کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گا۔

ظاہر بات ہے کہ کشمیر کے عوام محض اس لئے اپنے حقوق سے دست بردار نہیں ہو سکتے کہ ایک غیر نمائندہ حکمران جس کے خلاف وہ پہلے ہی علم بغاوت بلند کر چکے تھے' کاغذ کے ایک پرزے پر دستخط کر بیٹھا تھا۔ اس طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ پاکستان کے عوام پر اپنے کشمیری بھائیوں کی طرف سے جو ذمہ داری عائد ہوتی تھی اور جو احساسات اس بارے میں پاکستانی عوام کے تھے' انہیں ترک کر دینا ممکن نہ تھا۔ اسی بنا پر بہت سے لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ کشمیر میں ہندوستان کے داخلہ نے ہمیں جنگ کے کنارے پہنچا دیا ہے۔

اسی صبح کا ذکر ہے کہ ادھر سورج نکلا' ادھر ہندوستان نے ۳۳۰ فوجیوں کا پہلا دستہ طیارے میں بٹھا کر سری نگر میں اتار دیا ان دنوں قبائلی بارہ مولا میں تھے' اور ابھی انہوں نے پیش قدمی نہیں کی تھی۔ اس کے بعد سری نگر میں ہر ایک ایک گھنٹہ کے وقفے سے ہندوستانی فوجی دستوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ قبائلی لشکر کو غالباً اس نئی صورت حال کا علم نہ تھا۔ اس لئے وہ بارہ مولا میں خاموشی سے بیٹھے رہے۔

سری نگر میں ہندوستانی فوج کی آمد کی خبریں' البتہ دوسری جگہوں پر تیزی سے پھیل

رہی تھیں۔ جگہ جگہ اشتعال پیدا ہو رہا تھا۔ اور لوگ مدافعت کا پختہ ارادہ کر رہے تھے۔ شام ہوتے ہوتے آزاد کشمیر کی پہلی عبوری حکومت کا قیام عمل میں آگیا۔ سردار ابراہیم اس حکومت کے صدر تھے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب کشمیر علامتی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور نئی حکومت کو معاً اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑا کہ اب ہماری لڑائی ہندوستانی فوج سے ٹھن چکی ہے، لہٰذا یہ لڑائی خاصی طویل ہو گی۔

اسی شام کا ذکر ہے، پاکستان میں، وزیراعظم نے کشمیر کے الحاق اور ہندوستان کی فوجی مداخلت سے پیدا ہونے والی صورت حال پر غور کرنے کے لئے غیر سرکاری نوعیت کی ایک کانفرنس لاہور میں منعقد کی۔ اس کانفرنس میں چند دوسرے لوگوں کے علاوہ اس دور کے سیکرٹری وزارت دفاع (جو بعد میں صدر ہوئے) کرنل سکندر مرزا، سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی (جو بعد میں وزیراعظم ہوئے) صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خاں اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ بھی موجود تھے۔ بریگیڈیئر شیر علی اور مجھے بھی کانفرنس میں شرکت کے لئے بلایا گیا۔

میں نے اس کانفرنس میں یہ تجویز رکھی کہ جموں کو مخالفوں کے قبضہ سے چھڑانے کی ایک کوشش کرنی چاہئے۔ وہاں لے دے کے ایک ہی سڑک ہے، جس سے ہندوستان اپنی فوجی کمک، وادی میں اور کشمیر کے دوسرے حصوں میں پہنچا سکتا ہے۔ جموں پر قبضہ کے بعد اس کی ناکہ بندی کر دی جائے گی۔ میں نے یہ بالکل نہیں کہا تھا کہ اس مقصد کے لئے فوج استعمال کی جائے یا حکومت اپنے آپ کو اس معاملہ میں الجھائے۔ میں نے تو صرف یہ مشورہ دیا تھا کہ اس بارے میں قبائلیوں کو اجازت دے دی جائے کہ وہ ایک کوشش کریں۔ میرا خیال تھا کہ ہزار ہزار قبائلیوں کے تین لشکر استعمال کئے جانے چاہئیں۔ قبائلی موجود تھے۔ میں نے اپنی خدمات پیش کر دیں کہ ان کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں۔

ہندوستان کی فوجی مداخلت کے بعد جموں نے ایک انتہائی اہم مرکز کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ریاست میں داخل ہونے کے لئے ہندوستان کے پاس جموں سے گزرنے کے سوا، دوسرا کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ بری ذرائع سے آنے والی ساری فوجی کمک یہیں مرکوز ہو سکتی تھی۔ یہاں سے وہ لوگ وادی میں شمال کی طرف جا سکتے تھے۔ اور اس طرح اس پورے علاقہ میں اپنی فوجی کارروائیاں پھیلا سکتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جموں سے نوشہرہ جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف جاتے اس طرح راجوڑی اور پونچھ کے وسطی علاقوں میں، جہاں آزادی کا عمل تیزی سے جاری تھا اور جہاں اس وقت آزادی کی طاقتیں

عملاً صورت حالات پر پوری طرح قابو رکھتی تھیں اور اس علاقہ کی مالک تھیں ہندوستان کی فوجی پیش قدمی سے انہیں سخت خطرہ لاحق ہو جاتا۔ ان باتوں کے علاوہ اگر ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کوئی خطرناک رخ اختیار کرتے تو جموں کا فوجی مرکز' جو سیالکوٹ کے عین سر پر دھرا ہوا تھا۔ پاکستان کی سالمیت کے لئے سنگین خطرہ بن سکتا تھا۔

بہرحال' میری اس تجویز کی عبدالقیوم خاں اور نواب ممدوٹ کے سوا باقی سبھی نے مخالفت کی' چنانچہ اسے ترک کر دیا گیا۔ اس وقت لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ایسا کرنے سے ہندوستان مشتعل ہو کر پاکستان پر حملہ کر دے گا اور یہ خطرہ ہرگز مول نہیں لیا جا سکتا۔

پاکستان اور بھارت کے مابین کوئی بھی جنگ نہیں چاہتا تھا' مگر یہ سمجھنے کیلئے کافی وجوہ موجود تھیں کہ بھارت جنگ چھیڑنے کے قابل نہیں ہے۔ قبائلی لشکر پہلے ہی ریاست کے اسی میل اندر پیش قدمی کر چکے تھے' پہلے ہی وہ پاکستان کے علاقہ سے ہو کر گئے تھے اور پہلے ہی بھارت یہ سمجھتا تھا' غلط ہی سہی' کہ قبائلیوں نے میرپور' پونچھ' کوٹلی' جھانگر' نوشہرہ اور بھمبر کا محاصرہ کر رکھا ہے اس لئے بھارت کے پاس پہلے ہی یہ بہانہ تھا کہ وہ پاکستان کے خلاف جنگ چھیڑ سکتا' چونکہ اس نے اب تک ایسا نہیں کیا تھا' اس کی محض یہ وجہ تھی کہ وہ یہ خطرہ مول لینے کیلئے فوجی اعتبار سے اتنا مضبوط نہیں تھا' اس کی فوج کی تنظیم نو ہو رہی تھی' خود ملک کے اندر وہ کئی مشکلات سے دوچار تھا۔ اسے یہ خطرہ بھی تھا کہ قبائلیوں کا سیلاب مشرقی پنجاب میں داخل ہو جائے گا جہاں لوگوں میں اس قدر خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا کہ وہاں بارہ مولا کے حوالہ سے یہ مبالغہ آمیز اطلاعات گردش کر رہی تھیں کہ چودہ ہزار کی غیر مسلم آبادی میں صرف تین ہزار باقی بچے ہیں۔

اس رات کانفرنس میں دوسری جانب کے بارے میں اطلاعات کہیں زیادہ وزنی تھیں تاہم کوئی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ چند ہی ہفتوں کے بعد قبائلی اپنی جگہوں سے جموں کے خلاف بھرپور سرگرمیاں شروع کر رہے ہوں گے' چاہے اس وقت دیر ہو چکی ہو گی اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہ ہو گا اور یہ بھی کہ چند ہی مہینوں میں کئی ہزار پاکستانی فوجی کشمیر میں بھارتیوں کے ساتھ نبرد آزما ہوں گے اور اس کے نتیجہ میں بھی پاک بھارت جنگ نہیں ہو گی۔

یہاں اس امر کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں' جس کا علم ہمیں چند سال کے بعد ہوا کہ اسی رات خود قائداعظم نے جموں پر حملہ کا حکم دیا تھا۔ اس حکم کا اور اس کے افسوسناک

انجام کا حوالہ ایلن کیمبل (Allan Camphell) نے اپنی کتاب "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" میں صفحہ ۲۲۶ پر دیا ہے' ہوا یہ کہ قائداعظم کا حکم قائم مقام کمانڈر انچیف جنرل گریسی کو ملا- یہ صاحب جنرل میسروی کی غیر حاضری کی عارضی مدت میں اس عہدہ پر فائز تھے- جنرل گریسی کو وہ حکم گورنر مغربی پاکستان کے ملٹری سیکرٹری کی وساطت سے ملا- گریسی نے جواب دیا کہ میں سپریم کمانڈر کی تصدیق کے بغیر ایسی کوئی ہدایت جاری نہیں کر سکتا- (سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل آکنلک' ان دنوں دہلی میں براجمان تھے) ایلن کیمبل کے الفاظ ممکن ہے' کسی قدر گمراہ کن ہوں- زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ جنرل گریسی نے دلائل پیش کرتے ہوئے' قائداعظم کو اپنا حکم واپس لینے پر آمادہ کیا ہو گا اور جنرل کے دلائل مثال کے طور پر یہی ہو سکتے ہیں' کہ ابھی تو پاکستانی فوج کی تنظیم ہونی باقی ہے اور ایک غیرجانبدار سرحدی فوج' ایک اور جنرل کے ماتحت پنجاب میں مقیم ہے اور اگر دونوں ریاستوں میں جنگ چھڑ گئی تو یقینی اندیشہ ہے کہ برطانوی حکومت' فوج سے اپنے تمام افسروں کو واپس بلا لے-

آج تو اہمیت اس بات کی ہے کہ جو کچھ ان دنوں ہوا' اس کا نتیجہ کیا نکلا- جموں کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا لیکن ہرچند کہ ہم نے جموں کو چھوڑ دیا' جموں نے ہمیں نہیں چھوڑا کیونکہ آنے والے زمانے میں' ہندوستانی فوجوں کو' اسی کھلے ہوئے دروازے سے شمال اور مغرب کی طرف نہایت آزادی سے گزرتے رہنا تھا- اس وقت جموں میں مداخلت نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کو اپنی پوری توجہ سری نگر پر مرکوز رکھنے کا موقع مل گیا- جہاں وہ اپنی فوجیں' زیادہ سے زیادہ تعداد میں جس قدر اس کے طیارے اٹھا سکتے تھے' بھیجتا رہا-

اس پر اب تک دلائل دیئے جاتے رہے ہیں کہ جموں پر حملہ بالکل جوا ثابت ہوتا جس کا پاکستان کے وجود کے ساتھ تعلق ہوتا' میں اس سے متفق نہیں ہوں' حقیقت میں یہ پرخطر تھا مگر اس خطرہ کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی تھی' یہ کوئی جوا نہ تھا- فوجی جوا وہ ہوتا ہے جس کا مطلب مکمل شکست یا مکمل فتح ہوتی ہے اگر آپ فتح حاصل کرتے ہیں اور شاید بہت کچھ گنوا بیٹھتے ہیں تو جوا اسے کہتے ہیں اور فوجیوں کو یہ کام کبھی نہیں کرنا چاہئے بشرطیکہ حالات ایسے ہو جائیں کہ گنوانا ہر صورت میں لازمی ہو جائے- کسی ایسے معاملہ میں ہتھیار ڈالنے اور جوا کھیلنے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے- دوسری جانب منصوبہ بندی کر کے جو خطرہ مول لیا جائے اس میں ہوتا یہ ہے کہ فتح کی صورت میں فوائد اتنے ہوتے

ہیں کہ ان کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی، مگر جب ناکامی ہو تو سب کچھ ختم نہیں ہو جاتا اور اگلے روز لڑائی سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ منصوبہ بندی کر کے مول لینے والا خطرہ ہوتا ہے جس سے عظیم کمانڈر اپنے سے طاقت میں بڑے دشمنوں پر فتح حاصل کرتے ہیں۔

یہ ایسے ہی لگے گا کہ جموں پر حملہ میں کوئی جوا نہ تھا، اگر ہم اس پر قبضہ کرنے میں ناکام ہو جاتے تو پھر بھی ہمیں کئی فائدے حاصل ہوتے، حملہ اور حملے کے اعادہ کا خطرہ جموں میں بڑے پیمانہ پر فوجیں جمع کرنے کا سبب بنتا اور اس طرح انہیں سری نگر وادی کی طرف شمال میں بڑھنے اور مشرق میں نوشہرہ کی جانب حرکت کرنے سے روکا جا سکتا تھا، اس طرح ہمیں بعد میں کافی دردِ سر سے نجات حاصل ہو جاتی، دوسری طرف اگر اس حملہ کے نتیجہ میں پاک بھارت جنگ شروع ہو جاتی تو پاکستان کے مکمل نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، بھارتی فوج ہم سے تعداد میں دوگنی ہی تو تھی اور تاریخ ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ لوگوں نے اس سے بھی بڑی مشکلات کا سامنا کیا ہے، کچھ بھی ہوتا، ساری بھارتی فوج تو ہمارے مقابلہ میں لا کر کھڑی نہیں کی جاتی تھی کیونکہ حیدر آباد میں اسے فوجی خطرہ کی فکر بھی تھی اگر وہ مشرقی پاکستان گئے ہوتے تو انہیں نہ صرف کشمیر سے دستبردار ہونا پڑتا بلکہ مشرقی پنجاب بھی ظاہر ہو جاتا جس کے متعلق انہیں ڈر تھا کہ ہم دو لاکھ مسلح قبائلیوں کا سیلاب بہا دیں گے۔ اور یہ واقعی ایسی بات تھی جو ان کے ہوش اڑا دینے والی تھی۔

مزید براں، بھارت پہلے ہی جوناگڑھ کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کر چکا تھا حالانکہ اس نے قانون کے مطابق پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا تھا کشمیر میں ہماری جانب سے اسی قسم کی کارروائی اقوام متحدہ یا دنیا کو بھارت کا ساتھ دینے والا نہ بنا سکتی تھی لہٰذا ان حالات میں یہ کہنا کہ جموں پر حملہ جوئے کے مترادف ہوتا، ہوش مندی کی بات نہیں۔

ایک آزادی دہندہ کمیٹی کے قیام کے بارے میں میرا مشورہ مان لیا گیا۔ مدعا یہ تھا کہ وہ کمیٹی ہماری کوششوں کو مربوط کر کے ان کا رخ کشمیر کی طرف قائم رکھے۔ کانفرنس رات کے دو بجے ختم ہوئی۔ مجھ سے یہ کہا گیا کہ صبح آکر وزیرِ اعظم سے ملاقات کروں۔

دوسری صبح مجھے بتایا گیا کہ مجھے مذکورہ کمیٹی میں فوج کے رکن کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کام میں یکسوئی سے حصہ لینے کے لئے مجھے جنرل ہیڈ کوارٹر کے فرائض سے سبکدوش کر دیا گیا۔ مجھے راولپنڈی میں قیام کرنا تھا۔ اور کشمیر کے سلسلہ میں اپنے کام کو برطانوی افسروں اور جنرل ہیڈ کوارٹر سے خفیہ رکھنا تھا۔ فوجی افسروں یا رینک کے دوسرے

افراد کو ابھی جنگ میں حصہ نہیں لینا تھا۔

آزادی دہندہ کمیٹی کے دوسرے ارکان میں سردار ابراہیم' خواجہ رحیم' فنانس کے ایک افسر (مسٹر غلام محمد) اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے میجر یوسف بھی شامل تھے۔ میجر یوسف کے فرائض قبائلیوں سے متعلق تھے۔

جب میں نے یہ وضاحت چاہی کہ ہمارا فوجی مقصد کیا ہو گا۔ تو وزیر اعظم نے جواب دیا کہ جو کچھ میں چاہتا ہوں' وہ محض یہ ہے کہ جنگ تین مہینہ تک جاری رہے۔ یہ عرصہ مذاکرات اور دوسرے ذرائع سے ہمارے مقاصد کے حصول کے لئے کافی ہو گا۔

میرا دماغ سب سے زیادہ اس بات سے پریشان تھا کہ اسلحہ کا بندوبست کیا ہو گا۔ اب کہ ہم جموں سے دستکش ہو رہے تھے۔ ہندوستانی فوج' فوراً وہاں اپنا اڈہ جما لے گی اور انہیں ساز و سامان کی سپلائی دھڑا دھڑ ہوتی رہے گی۔ اس کے بعد ہمارے آدمیوں کو ایک باقاعدہ فوج کے ساتھ لڑائی کرنی پڑے گی' جس کے پاس اسلحہ اور ساز و سامان کی فراوانی ہو گی۔ ہر فوجی دستے کے پاس فی کس سو راؤنڈ ہوتے تھے اور سو راؤنڈ بریگیڈ کے پاس ریزرو میں رکھے ہوئے تھے اور مزید سو راؤنڈ ڈویژن کے ریزرو میں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ ان سب کے علاوہ ہندوستان کی اسلحہ ساز فیکٹریاں فوجوں کی پشت پر ہوں گی اور سامان تیار کر کر کے بھیجتی جائیں گی۔

مخالفوں کی اس طاقت کے مقابلہ میں اگر ہمیں دس ہزار آدمیوں کو بھی ہتھیار بند رکھنا تھا۔ جن میں قبائلی بھی شامل تھے اور انہیں پورے ایک مہینہ کے لئے گولہ بارود محض سو راؤنڈ فی کس مہیا کیا جاتا' تب بھی ہمیں تین مہینہ کے لئے گولہ بارود کے تیس لاکھ راؤنڈ درکار تھے۔ اور اس وقت تک راولپنڈی میں صرف دو لاکھ راؤنڈ جمع ہو سکے تھے اور اس میں سے بھی ایک لاکھ قبائلیوں نے جو سری نگر کی طرف بڑھ رہے تھے' پہلے ہی مانگ رکھا تھا۔

۲۸ تاریخ کی سہ پہر کو میں یہ اطمینان کرنے کے لئے فوراً پنڈی پہنچا کہ قبائلیوں کو مطلوبہ اسلحہ بروقت مل رہا ہے۔

باب ٦

سری نگر کی طرف

دوسری صبح ۲۹ر اکتوبر کو میں اور ایک اخباری نامہ نگار علی اختر مرزا حالات کے بچشم خود مشاہدہ کے لئے سری نگر روانہ ہو گئے۔

غروب آفتاب سے اک ذرا پہلے ہم نے کوہالہ کے قریب کشمیر کی سرحد پار کی اس سے پہلے ہمیں آگے بڑھنے کی اجازت نہ ملتی' کیونکہ ہندوستانی طیارے موقع پر پہنچ گئے تھے اور سڑک پر گاڑیوں کی آمدورفت ممنوع تھی۔ اس وقت لوگوں میں کھلبلی پھیل چکی تھی۔ اس کے باوجود کچھ بہت زیادہ سرگرمی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہم سڑک پر بیس میل تک نہایت خاموشی سے چلتے گئے۔ ہمارے بائیں جانب دریائے جہلم روانی سے بہہ رہا تھا اور دائیں جانب ٹیلے تھے جو تیزی سے اندھیرے میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ سڑک پر دور دور تک کسی آدم زاد کا پتہ نشان نظر نہ آتا تھا۔ دور دیہات میں جھونپڑیاں تاریک نظر آتی تھیں۔ نہ روشنی تھی' نہ آواز۔ کوئی علامت جنگ کی دکھائی نہ دیتی تھی۔

اور تب مظفر آباد پہنچتے ہی یہ منظر اچانک تبدیل ہو گیا۔ جیسے کسی نے پردہ اٹھا دیا ہو۔ قبائلی سری نگر کی طرف جا رہے تھے ہماری آنکھوں میں یہ منظر پرانی تاریخ کے ایک ورق کی طرح زندہ ہو گیا۔ صدیوں پرانے دور کی یادیں حافظہ میں بیدار ہو گئیں۔ محسوس ہوتا تھا کہ بالکل یہی منظر رہا ہو گا۔ جب ہمارے آباء و اجداد عین اسی طرح سرحد کے پہاڑی دروں سے گذر کر ہندوستان میں داخل ہوئے ہوں گے۔ یہاں بھی وہی سنگلاخ پہاڑ تھے۔ اور یہ غالباً انہی پرانے لوگوں کے فرزند تھے وضع بھی انہی کی سی تھی۔ کم و بیش ویسے ہی لباس پہنتے تھے اور ایک نامعلوم مستقبل کی جانب بالکل انہی کی طرح رواں دواں تھے۔ ہاں البتہ یہ ہے کہ ان دنوں لوگ پاپیادہ یا گھوڑوں پر سوار قافلوں کی صورت میں چلتے تھے' جب کہ یہ ایک فوجی کانوائے تھا' اور کانوائے بھی کہاں تھا' کیونکہ نہ تو کسی نے انہیں منظم کیا تھا اور نہ کوئی ان کی کمان پر تھا۔ بس اتنی سی بات تھی کہ یہ تھوڑے بہت لوگ مظفر آباد میں اکٹھا ہو گئے تھے جو کشمیر کی سرحد کے اندر واقع ہے اور ریاست کے دارالحکومت سری

نگر تک پہنچنے کا یہی ایک راستہ تھا اور انہیں وہاں پہنچنا ضرور تھا۔

ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے دو دن بعد کا یہ واقعہ ہے۔ اس سے چھ روز پہلے سرحد کے قبائلیوں نے یہاں سے کشمیر پر اپنے حملہ کا آغاز کر دیا تھا۔ حملے کے چوتھے روز ریاست کا مہاراجہ دارالحکومت سے بھاگ گیا۔ اس کے دوسرے دن ہندوستان نے مداخلت کی اور اس کی فوجیں طیارے میں سری نگر پہنچنے لگی تھیں۔

اب آزادی کی جدوجہد میں امداد کے لئے مزید پٹھان پہنچنے لگے تھے۔ لاریاں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ جن میں ۴۰ اور ۵۰ اور بعض دفعہ تو ۷۰، ۷۰ پٹھان بھرے ہوتے تھے۔ یہ لوگ بس کے اندر ٹھنسے ہوتے، چھتوں پر لیٹے ہوتے، انجن پر بیٹھے ہوتے اور مڈگارڈ سے لٹکتے ہوتے تھے۔ ان میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ سفید ریش بوڑھے بھی اور نوعمر لڑکے بھی ان میں شاید ہی کوئی خوش پوش ہو گا۔ بہتوں کے تن پر پھٹے ہوئے کپڑے تھے اور کچھ تو ننگے پاؤں تھے، لیکن انہیں دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ وجاہت اور رعب ان کے چہروں سے ٹپکتا تھا۔

ان کے اسلحہ بھی کئی وضع کے تھے۔ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور سرحدی ساخت کی رائفلیں تھیں دور مار اور قریب کی مار کے پستول تھے۔ **بعضوں** کے پاس سرے سے کوئی اسلحہ نہ تھا۔ وہ اس ارادہ سے ساتھ ہو لئے تھے کہ اسلحہ دشمن سے چھینیں گے۔ فی الوقت ان کے پاس صرف چھرے تھے۔ ان کی گاڑیاں بھی اسی طرح مختلف کنڈے کی تھیں۔ ان میں مناسب حال کی بسیں بھی تھیں اور چار پہیے کی ایسی گاڑیاں بھی، جو سڑک پر صرف رینگ سکتی تھیں۔ ایک نہایت دقیانوسی کار بھی تھی، جس کی چھت ندارد تھی، اس میں بتیاں بھی نہیں تھیں، بریک بھی قابل اعتماد نہ تھے۔ ۸، ۹ آدمی اس کار میں سوار جھنڈے اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ سوات کی فوج کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ گاڑیوں کے انجن معمول سے کہیں زیادہ بوجھ اٹھائے ہوئے بڑی مشکل سے کھسک رہے تھے۔ انہیں اپنی منزل پر پہنچنے میں بڑا وقت لگے گا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ لوگ تو لڑنے کے لئے آئے ہیں، صدیوں کے حملوں اور مہموں کی یادیں ان کے خون میں رچی ہوئی ہیں۔ کسی نہ کسی طرح یہ اپنی منزل تک پہنچ ہی جائیں گے ان کے حوصلے بلند تھے، ان کی رفتار کے شور میں جنگی ترانوں کی گونج اور بعض دفعہ ڈھول کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ ماحول میں غیر معمولی جوش و خروش تھا۔ کامیابی ان کے قدم چومنے والی ہے۔

بہرحال ہمارے لئے ممکن نہ تھا کہ ان کی رفتار سے آگے بڑھتے' لہٰذا رہ رہ کر آگے نکلنے کی کوشش کرتے۔ آخر تھوڑی دشواری سر کرنے کے بعد ہمیں قافلے سے آگے نکلنے کا راستہ مل گیا۔ اب کھلی سڑک ہمارے سامنے تھی۔ مظفر آباد سے پچاس میل دور اڑی میں ہم نے دیکھا کہ پل ٹوٹا ہوا ہے۔ چند روز پہلے جب قبائلیوں نے مظفر آباد پر حملہ کیا تھا اور ریاست کی فوجوں کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے تو ان فوجوں نے پسپا ہوتے وقت پل کو ڈھا دیا تھا۔ لیکن مقامی لوگ اس وقت خاصی بڑی تعداد میں ادھر ادھر سے نکل آئے۔ انہوں نے راتوں رات ' بڑی عجلت اور محنت سے' پہاڑی کے دامن میں ایک میل لمبا راستہ کاٹ کر بنا دیا تھا۔ اس طرح قبائلیوں کو یہ آسانی مہیا کر دی کہ آگے بڑھ کر دشمنوں کا صفایا کریں۔

قبائلی یہاں ۲۶ر کو پہنچے تھے۔ اس وقت تک کشمیر نے ہندوستان سے الحاق نہیں کیا تھا اور ہندوستانی فوجیں طیاروں سے وہاں نہیں پہنچی تھیں۔ ریاستی فوج جس کے حوصلے انتہائی پست تھے۔ منتشر ہو کر بھاگ نکلی تھی۔ اب پختہ سڑک کے صرف ۳۵ میل رہ گئے تھے۔ اور اس وقت تک بالکل کوئی مزاحمت نہیں ہوئی تھی۔ قبائلیوں کے لئے بھی بمشکل دو گھنٹہ کی مسافت باقی رہ گئی تھی۔ سامنے سری نگر تھا جو بظاہر ان کے رحم و کرم پر کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ لیکن قبائلی اس روز آگے نہیں بڑھے اور نہ دوسرے دن آگے جا سکے۔ بالآخر ۲۸ تاریخ کو جب انہوں نے پیش قدمی کی تو ہندوستانی فوجوں سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی ایک روز پہلے یہ فوجیں ایک سو طیاروں میں سوار ہو کر ریاست میں اتری تھیں۔ اگرچہ بارہ مولا سے دس میل باہر انہیں کامیابی سے شکست دی جا چکی تھی۔ تاہم اس کام میں ایک پورا دن ضائع ہو گیا۔ اس کے بعد کہیں ۲۹ر کی شام تک قبائلی' سری نگر کی طرف پیش قدمی میں کامیاب ہو سکے اور اب وہ ہم سے بمشکل چند گھنٹہ آگے تھے۔

اتنی زبردست اہمیت کے دو دن' بارہ مولا میں کیوں ضائع ہو گئے؟ یقینی بات ہے کہ اگر یہ دو دن ضائع نہ ہوتے تو آج کشمیر کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔ اس تاخیر و التوا کا کوئی مصدقہ سبب آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔

بارہ مولا سے آگے سڑک سنسان تھی۔ کبھی کبھار اکا دکا لوگ' اجاڑ گاؤں میں چوری چھپے ادھر ادھر بھاگتے ہوئے نظر آ جاتے تھے۔ یہ بیشتر مقامی لوگ تھے۔ جو لوٹ کا مال بٹور رہے تھے' لیکن ابھی تک کسی لڑائی کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ محاذ کس طرف کو ہے اور نہ ہمیں کسی طرح کی اطلاع دینے والا' وہاں کوئی موجود تھا۔ ہمیں

بس اتنا معلوم تھا کہ لڑائی' اوپر کسی طرف پہاڑیوں میں ہو سکتی تھی۔ اور سڑک پر ممکن ہے اس وقت دشمنوں کا قبضہ ہو۔ لیکن ہمیں یہ بات معلوم کیسے ہو سکتی تھی' چنانچہ ہمیں آگے بڑھنے کے لئے اپنی رفتار مدھم کرنے کے ساتھ ہی گاڑی کی بتیاں بجھا دینی پڑیں۔

ہم کوئی دس میل گئے ہوں گے کہ ایک جگہ الاؤ کے گرد کچھ قبائلیوں کو سوتا ہوا پایا۔ تقریباً پانچ میل آگے بڑھنے کے بعد سڑک کے کنارے کچھ پرچھائیاں سی حرکت کرتی نظر آئیں۔ آدھ گھنٹہ کی مسافت اور گزر گئی۔ اب یہاں سے دور سری نگر کی روشنیاں ہمیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ بالاخر اس وقت گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ اب ہم محاذ کے بالکل قریب جا پہنچے تھے۔ جلد ہی ہم نے دیکھا کہ کچھ لوگ زخمیوں کو اٹھائے لئے جا رہے ہیں۔ یہاں سے کوئی آدھ میل اور آگے بڑھے۔ اب گولے سڑک پر آ آکر گر رہے تھے۔ لیکن فائرنگ رفتہ رفتہ بند ہو رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا حملہ ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔ سری نگر کے باہر یہ ٹھیک چوتھا میل تھا۔ یعنی شہر یہاں سے چار میل دور رہ گیا تھا۔

دشمن نے چوتھے میل پر سڑک کے درمیان رکاوٹ کھڑی کر دی تھی قبائلیوں کو جب اس رکاوٹ کا علم ہوا تو انہوں نے سڑک سے الگ اونچے نیچے راستے سے چھپ کر اور گھوم کر آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ دشمن اندھیرے میں اٹکل پچو گولے پھینک رہا تھا اور اس سے قبائلیوں کو اب تک کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ لیکن آخری چند سو گز کی حدود میں صورت حال مختلف تھی۔ معلوم نہیں' قبائلیوں کو اس کا علم تھا یا نہیں تھا کہ سری نگر کا بیرونی علاقہ زیادہ تر پانی میں ڈوبا رہتا ہے کہیں بارش کا پانی اور جوہڑ ہے۔ کہیں جھیل اور دریا ہیں' کہیں دھان کے کھیت ہیں غرض کہ ہر طرف زیادہ تر پانی ہوتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ دشمن کی چوکی سے جوں جوں قریب ہو رہے تھے' اسی قدر پانی کی وجہ سے سڑک پر آتے جا رہے تھے۔ اور بالاخر انہیں یہی ایک راستہ نظر آیا ہو گا کہ دشمن کی چوکی پر حملہ کرنے کے لئے تنگ سڑک پر سیدھے بڑھتے جائیں اور بظاہر یہی طریقہ انہوں نے اختیار کیا تھا۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ محسود اور وزیری جیسے کار آزمودہ قبائل نے کبھی یہ طریقہ اختیار نہ کیا ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خاص گروہ' جس میں بیشتر مہمند قبائلی شامل تھے' مناسب تجربہ نہ رکھتا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ تازہ کامیابیوں نے ان میں بہت زیادہ خوداعتمادی پیدا کر دی ہو نتیجہ یہ کہ انہوں نے احتیاط کے مسلمہ اصولوں کو بھی نظرانداز کر دیا تھا۔ غرض یہ کہ قبائلی عین سڑک پر بڑھتے گئے اور بالاخر دشمن کی بھرپور گولہ باری کی زد میں آ گئے۔ سامنے سے رائفلیں' برین گنیں اور مشین گنیں گولیاں برسا رہی تھیں اور

توپ کے گولے آ آ گر رہے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حملہ ناکام ہو گیا اور اب کہ رات تقریباً گزر چکی تھی' اس وقت کوئی اور کارروائی نہیں ہو سکتی تھی۔

صبح کے چار بجے تھے' یہی وقت تھا کہ چھپنے کے لئے کوئی جگہ ڈھونڈی جائے۔ پیچھے کچھ فاصلے پر چنار کے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ ہم نے یہیں اپنی گاڑی کھڑی کی اور آرام کرنے کی ٹھانی' لیکن سونے کے لئے اب وقت کہاں رہ گیا تھا۔ جلد ہی صبح کا اجالا افق پر پھیل گیا اور حسن قدرت کی سرور انگیز تصویر سے گویا پردہ اٹھ گیا۔ صبح نہایت خنک' خوشگوار اور نکھری ہوئی تھی کچھ فاصلے پر برف پوش پہاڑیاں دھوپ میں جھلمل کر رہی تھیں' پرندے شاخوں پر چہک رہے تھے' مرغابیاں اور قاز سورج کی روشنی میں اپنے خوش رنگ پروں کی چھب دکھاتے' قطار اندر قطار پرے جمائے گزر رہے تھے۔

ایک ہندوستانی بمبار طیارہ پوری گھن گرج کے ساتھ اڑتا ہوا ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔ طیارہ کچھ دیر تک اس علاقہ میں چکر لگاتا رہا اور پھر درختوں کے جھنڈ پر کہیں بم گرا کر اور کہیں مشین گن سے گولیاں برسا کر چلا گیا۔ فوراً بعد دوسرا طیارہ آ گیا' وہ گیا تھا کہ تیسرا آ گیا اور یہ سلسلہ تمام دن جاری رہا۔ کسی نے جواب میں ان پر گولی نہیں چلائی۔ فضا میں انہیں پوری آزادی حاصل تھی' وہ بہت نیچے اڑ رہے تھے' یہاں تک کہ کبھی کبھی درختوں کی چوٹی سے بھی نیچے آ جاتے تھے۔

ٹھنڈے یخ پانی سے ہاتھ منہ دھونے اور خوب ڈٹ کر ناشتہ کرنے کے بعد' میں یہ معلوم کرنے کے لئے نکلا کہ ان لوگوں نے سری نگر کی حفاظت کا کیا انتظام کیا ہے۔ اس وقت ہر کام معطل تھا' محاذ جنگ پر دشمن کے طیاروں کی آمد کے بعد ہر کارروائی کو اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا تھا۔ جب تک اندھیرا نہ ہو جائے۔ اب چند ہی لوگ گھومتے پھرتے نظر آئے' اس طرح کی نقل و حرکت میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ سوائے' دشمن طیارے کی پرواز کے' لیکن اسے جھکائی دے کر بچ نکلنا آسان تھا۔ کھلے علاقہ میں یہ ممکن ہے کہ قبل اس کے کہ طیارہ کسی شخص کی نشاندہی کرے' وہ شخص طیارہ کو دیکھ لے اور جب ایسا ہو تو دشمن کی نگاہ سے بچنے کے لئے بس اتنا کافی ہو گا کہ دم سادھ کر بیٹھ رہے۔

اس طرح چند گھنٹہ تک اطمینان سے ادھر ادھر گھومتا رہا۔ میرے پاس دوربین اور نقشہ تھا۔ اس کی مدد سے مجھے زمین کا کچھ اندازہ ہو گیا۔ ہماری طرف سے سری نگر پہنچنے کے تمام راستے پانی میں ڈوبے ہوئے تھے اگرچہ سردی کی وجہ سے پانی خشک ہو کر کم رہ گیا

تھا، لیکن پھر بھی اتنا تو تھا کہ خاص سڑک تک، یا چند راستوں تک اور بند تک پہنچنے میں رکاوٹ بنتا اور ان راستوں پر دشمن کی چوکیوں سے گولہ باری کا پورا امکان تھا۔ جیسا کہ گذشتہ رات تجربہ ہو چکا تھا۔ ان راستوں سے جوابی گولہ باری کے بغیر حملہ کرنا بالکل بے فائدہ تھا۔ سری نگر کی پوزیشن بطور مجموعی اس وقت بھی کمزور معلوم ہو رہی تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ ریاستی فوج کے حوصلے پست ہیں اور سری نگر کی آبادی اگرچہ بے تعلق سی بیٹھی ہے، لیکن ان کا رویہ ریاستی فوج کی طرف معاندانہ ہے۔ اس مرحلہ میں ہندوستانی فوج کی تعداد تین بٹالین سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اس کے مقابلہ میں شہر کی بیرونی سرحدیں کئی میل طویل اور پیچیدہ تھیں اور اسی بناء پر فوجی چوکیاں تعداد میں کم اور دور دور کے فاصلوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ اور ایک دوسرے کی مدد کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اس دن تک بھی کسی حقیقی اور موثر دفاع کا انتظام وہاں نہیں تھا۔ شہر میں اب بھی دہشت پھیلی ہوئی تھی، طیاروں اور فوجی دستوں کی موجودگی کے باوجود قبائلی لوگ شہر کے گرد اور طیارے اترنے کے جگہوں پر نہایت آزادی اور بے پروائی کے ساتھ گھوم پھر رہے تھے۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر قبائلی ایک بار شہر کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو جائیں تو انہیں باہر نکالنا ناممکن ہو گا۔ دہشت زدہ غیر مسلم تو بھاگ کھڑے ہوں گے۔ ان کی بھگدڑ سے سڑکیں اور شاہراہیں بند ہو جائیں گی اور جوابی کارروائی کے لئے ہندوستانی فوجوں کی پیش قدمی میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔ ریاستی فوج تو پہلے ہی تقریباً جواب دے چکی ہے اور ہندوستانی فوج کو زیادہ فکر اپنا ہوائی اڈہ بچانے کی ہو گی، کیونکہ ان کے لئے ہندوستان پہنچنے کا وہی ایک راستہ ہے۔ لہٰذا ایک بار اگر یہ حصار ٹوٹ جائے تو باقی اقدامات کے لئے خود ہی راستہ کھل جائے گا، لیکن سوال یہ تھا کہ اندر داخل کیسے ہوا جائے!

ایک امکان یہ نظر آتا تھا کہ رات میں کشتیوں میں سوار ہو کر یا پانی میں چل کر راستہ طے کیا جائے۔ اور قبائلی اس کے منتظر تھے۔ تاہم اس کے لئے مقامی لوگوں کی طرف سے مدد کی ضرورت تھی اور مضافات سے چونکہ مقامی لوگ بھاگ گئے تھے، لہٰذا نظر یہ آتا تھا کہ کشتیوں اور راستے دکھانے والوں کی تلاش میں خاصہ وقت گزر جائے گا اور بہرحال کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنا وقت لگے گا۔ اس دوران میں جو دن بھی ضائع ہو گا۔ اس کا نتیجہ ہوائی جہاز سے مزید ہندوستانی فوجوں کی آمد کی صورت میں نکلے گا۔ یہ منصوبہ کچھ زیادہ نتیجہ خیز نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا، جسے فی الوقت آزمایا جا سکتا تھا، اگرچہ یہ بھی ہے کہ تنہا اسی پر انحصار کرنے کا مطلب کامیابی کو بہت کچھ اتفاقات پر چھوڑ دینا تھا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے ایک بار پھر اسی سڑک کے بارے میں غور کرنا شروع کر دیا' جس پر گذشتہ رات کے حملہ کی واردات گزر چکی تھی۔ اس سڑک پر دفاعی پوزیشن کچھ خاص مضبوط نظر نہیں آتی تھی۔ یہاں ایسے کوئی آثار نہ تھے جن سے اندازہ ہوتا کہ کنکریٹ کے ستون' مورچے' کھائیاں یا بھاری رکاوٹ کی کوئی صورت موجود ہو گی۔ رکاوٹ کے لئے زیادہ سے زیادہ کانٹے دار تار نظر آتے تھے جن پر رائفل کا پہرہ تھا۔ یہ تار نہتے آدمیوں اور لاریوں کو روکنے کے لئے تو کافی تھے لیکن بھاری چیز کے سامنے ٹھہرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا اکیلی بکتربند کار انہیں توڑ کر آگے بڑھ سکتی تھی۔ اس رکاوٹ کا یہی جواب نظر آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر دو بکتربند کاریں ہوں تو یقیناً کام چل جائے گا۔ اور یہ کاریں پاکستان سے یہاں ۲۴ گھنٹہ کے اندر پہنچ سکتی ہیں۔ لہٰذا اب کام یہ رہ گیا ہے کہ فوراً واپس ہوا جائے اور بکتربند کاریں لائی جائیں۔ سورج غروب ہوتے ہی جب طیارے غائب ہو گئے اور سڑک دوبارہ محفوظ ہو گئی تو ہم پیچھے پلٹے بارش' کیچڑ اور ٹریفک نے ہمارا سفر ناقابل برداشت حد تک سست بنا دیا مگر یہ خوشگوار خیال دل میں جاگزیں تھا کہ بھارتیوں کی پوزیشن مضبوط ہونے سے پہلے بکتربند گاڑیاں لائی جائیں بکتربند گاڑیاں حاصل کرنے کیلئے بعض اعتراضات کا جواب دینا ضروری تھا' یہ کہا جا سکتا تھا کہ بھارت اسے پاکستان کی جانب سے مداخلت قرار دے گا مگر کیا اس کی کوئی وقعت ہو گی؟ بھارت خود مداخلت کر رہا تھا وہ پہلے ہی ہمیں حملہ آور قرار دے رہے تھے۔ بھارت نے خاص طور پر الزام لگایا تھا کہ پاکستان کے دو سو میل علاقہ سے قبائلی لائے جا رہے ہیں۔ کیا چند بکتربند گاڑیوں سے یہ الزام اور خراب ہو جائے گا؟

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے پاکستان اور بھارت میں جنگ شروع ہو سکتی تھی میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ہوتا کوئی فریق بھی اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا کشمیر کے ساتھ ہمارا ناقابل تنسیخ عہد استوار تھا' مگر کسی فریق کی بھی یہ خواہش نہیں تھی کہ تصادم وسیع ہو جائے' دونوں ملکوں کی حکومتیں ابھی تین ماہ پہلے وجود میں آئی تھیں اور وہ ابھی جم کر بیٹھنے بھی نہیں پائی تھیں پرانی فوج کی ابھی پوری طرح سے تقسیم بھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک غیرجانبدار باؤنڈری فورس جس کی قیادت ایک برطانوی جرنیل کر رہا تھا' بھی موجود تھی ایک برطانوی مشترکہ سپریم کمانڈر بھی موجود تھا جس کے پاس خاصے اختیارات تھے لاکھوں مہاجرین ایک سے دوسرے ملک میں منتقلی کے عمل سے دوچار تھے روزانہ ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے کہ دونوں حکومتوں اور فوجوں کے خلاف الزامات عائد کئے جاتے تھے

ایک اور واقعہ رونما ہونے سے کیا فرق پڑ جاتا تھا' مزید الزام تراشی' مزید شکایتیں' یہی کچھ ہو گا' ان حالات میں بکتر بند گاڑیوں کا معاملہ مجھے بڑی امید افزا تجویز لگتی تھی' مگر یہ میری سوچ تھی' قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

پنڈی واپس پہنچنے پر میری ملاقات فوراً کرنل مسعود سے ہو گئی جنہوں نے یہ پیشکش کی کہ نہ صرف دو کاریں بلکہ اپنے یونٹ کی بکتربند کاروں کا ایک پورا سکواڈرن ساتھ لے چلیں گے۔ کرنل نے کہا کہ ہمارے آدمی سرکاری اجازت کے بغیر تمام تر اپنی ذمہ داری پر سادہ کپڑوں میں جائیں گے' موقع کی رعایت سے امداد کی یہ پیشکش بیحد حوصلہ افزا تھی اور بظاہر نظر آتا تھا کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ لوگ تیاری کر رہے تھے کہ میں نے اس دوران بریگیڈیئر شیر خاں لیفٹیننٹ کرنل ارباب اور راجہ غضنفر علی خاں سے جو مرکزی حکومت میں وزیر تھے اور راولپنڈی میں موجود تھے' مشورہ کیا۔ بریگیڈیئر شیر خاں اور راجہ غضنفر علی خاں نے اس خیال کی سختی سے مخالفت کی۔ ان کی رائے میں اگر ایسا ہوا تو یقیناً جنگ چھڑ جائے گی اور حکومت اسے ہرگز معاف نہیں کرے گی۔ بہرصورت اس کی کامیابی کے امکانات نہایت کم ہیں اور ایک بات مجھے یاد رکھنی چاہئے کہ وہ محاذ میری کمان میں نہیں لہٰذا یہ تجویز ترک کر دی گئی۔

بکتربند کاریں' قبائلیوں کی امداد کے لئے بھیجی نہ جا سکیں اور انہیں سری نگر میں داخل ہونے کے لئے کوئی اور طریقہ بھی میسر نہ آ سکا۔

باب ۷

قبائلی واپسی

اس کے چار دن بعد تک راولپنڈی کا ماحول زبردست توقعات سے لبریز تھا۔ قبائلیوں کی کامیابی کی خبریں اب تک برابر پھیلتی جا رہی تھیں اور جوں جوں وقت گزرتا' ان میں رزمیہ داستانوں کا جذباتی رنگ شامل ہوتا جا رہا تھا۔ سری نگر پر قبضہ تو یقینی بن چکا تھا اور لوگ سانس روکے بیٹھے' اس خوش آئند خبر کا انتظار کر رہے تھے۔

اس کے بعد' ایک صبح یہ خبر آئی کہ ہندوستانی سری نگر سے باہر نکل رہے ہیں اور قبائلی لوگ مدافعت کے بغیر پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں۔ یہ خبر سرحد کے وزیر اعلیٰ کی طرف سے آئی تھی' جو خورشید انور سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھے۔ وزیر اعلیٰ بھاگم بھاگ ایبٹ آباد پہنچے جہاں کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ ہو لئے اور اب ان سب کو قبائلی سرداروں سے ملاقات کرنی تھی۔

اسی روز' رات میں مجھے ایبٹ آباد سے فون پر اطلاع ملی کہ وہ لوگ آدھی رات تک پنڈی پہنچیں گے اور مجھ سے میرے مکان پر ملنے آئیں گے۔ عبدالقیوم خاں اور نواب ممدوٹ' جب قبائلی علاقوں کے سیکرٹری کرنل اے ایس بی شاہ کے ہمراہ میرے یہاں آئے تو ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ قبائلی ۶۵ میل تک پسپا ہو چکے ہیں اور اب انہیں محاذ پر آگے بڑھانے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں' انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ اس کے بعد کیا آپ یہ ذمہ داری قبول کر لیں گے؟

لیکن میرے کرنے کے لئے وہاں رہ کیا گیا تھا؟ اور اگر میں امداد کے لئے آمادہ بھی ہو جاتا تو' بہرحال' میں محض ایک سٹاف آفیسر تھا' جس کے پاس نہ تو سپاہیوں کے دستے تھے کہ انہیں جنگ میں جھونک دیتا نہ تو بندوقیں تھیں کہ انہیں جھٹ پٹ محاذ پر بھجواتا۔ انہوں نے کچھ دوسرے لوگوں سے بھی ملاقاتیں کی تھیں' لیکن معاملات جہاں تھے' وہیں رہے۔ انہوں نے پنڈی' ایبٹ آباد' نوشہرہ اور پشاور میں سینئر پاکستانی کمانڈروں سے ملاقاتیں کی تھیں' لیکن کہیں سے کوئی مدد نہیں ملی۔ پھر بھی اس قضیہ کو یوں تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا

چنانچہ میں نے اس ایک خدمت کی پیشکش کر دی جو مجھ سے ممکن تھی- یعنی یہ کہ میں محاذ پر خود جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ آیا' وہاں کیا ہو سکتا ہے! انہوں نے وعدہ کیا کہ ٹرانسپورٹ کے لئے مجھے ایک سٹیشن ویگن اور ایک وائرلیس سیٹ جو کہیں سے چھینا تھا' مجھے دیں گے- کیپٹن تسکین الدین شاف آفیسر کے طور پر میرے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے اور میں نے وائرلیس سیٹ پر کام کے لئے دو رضاکار سگنلر ساتھ لے لئے- دوسری صبح' میں روانگی کے لئے تیار تھا-

محاذ سے قبائلیوں کی واپسی کی صورت یہ نہیں تھی کہ ایک ایک قدم کر کے پسپا ہوئے ہوں- بلکہ وہ تو دفعتاً" محاذ سے الگ ہوئے اور آناً" فاناً" غائب ہو گئے- اتنی شاندار پیش قدمی کا یہ اچانک خاتمہ' واقعی حددرجہ حیران کن تھا- وادی کے باشندوں نے جو نسلاً" بعد نسل ایک اجنبی حکمراں کے استبداد کے تحت زندگی گزارتے آئے تھے' یہ قیاس بھی نہیں کیا تھا کہ کبھی آزاد ہوں گے- اس کے بعد دفعتاً" یہ نظر آیا کہ جلالت ماب مہاراجہ کا راج سنگھاسن بس اب زمین بوس ہونے کو ہے اور پھر یہ بات بھی اتنی ہی غیر متوقع تھی کہ وہ دفعتاً" یک رو تنہا رہ گئے- اور انہیں ایک بار پھر اسی ظالم حکمران کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا-

مہاراجہ اپنے قانونی استحقاق کی آڑ میں اطمینان سے بیٹھا تھا اور اس کی فوج نے نہایت حقارت کے ساتھ یہ گمان کیا تھا کہ سرحد پر معمولی انتشار سے بھلا کوئی اور کارروائی کیا ہو گی- لیکن چوٹ اتنی بھرپور لگی تھی کہ مہاراجہ تو حملہ کے چوتھے دن دارالحکومت سے نکل بھاگا تھا- اور اب یہ دیکھئے کہ بمشکل ایک ہفتہ بعد' جب کہ اسے اپنی ہر چیز سے محرومی کا بالکل یقین ہو چکا تھا' وہ ایک بار پھر' اپنی سب سے زیادہ عزیز متاع' یعنی وادی کا مالک بنا بیٹھا تھا-

ہندوستان اور پاکستان کے تجربہ کار سپاہیوں نے' جو قبائلیوں کی امکانی صلاحیتوں اور کوتاہیوں کے ضمن میں ماہر سمجھے جاتے ہیں- اس وقت یہ پیش بینی کی تھی کہ محض چند جھڑپیں اور کچھ لوٹ مار کے واقعات ہوں گے- لیکن ہوا یہ کہ قبائلی' کشمیر میں برق رفتاری کے ساتھ ۱۲۰ میل تک اندر گھس گئے تھے اس سے ماہروں کی اصابت رائے پر وہ ضرب پڑی کہ سب کے سب چکرا کے رہ گئے تھے- لیکن ابھی انہوں نے اپنی قیاس آرائیوں میں ترمیم کی ہی تھی کہ ادھر ایک دم پسپائی شروع ہو گئی اور آن کی آن میں سب رفوچکر ہو گئے- اب سوال یہ تھا کہ قبائلیوں کے اس عمل سے وہ کیا نتیجہ اخذ کریں گے؟ کم از کم

ہندوستان کی طرف تو بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ ان لوگوں نے قبائلیوں کے سرے سے غائب ہو جانے کو محسوس ہی نہیں کیا' یا اسے بھی ان کی ایک چال سمجھی' وہ اس لئے کہ قبائلیوں نے جو خلا چھوڑا تھا' اسے پر کرنے کے لئے ہندوستانی آگے نہیں بڑھے۔

ہندوستانی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے ۷ر نومبر کو سری نگر کے مضافات میں ۱۲ گھنٹہ جنگ کی تھی' حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ قبائلی' اس سے دو دن پہلے ہی اکا دکا چھاپہ ماروں کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ آئے تھے۔ ہندوستانی یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ قبائلی' اس روز پسپا ہوتے وقت کھیتوں میں اپنی پانچ سو لاشیں چھوڑ گئے تھے۔ حالانکہ شمال مغربی سرحد کے قبائلیوں سے جو لوگ تھوڑا سا بھی واقف ہیں' انہیں معلوم ہو گا کہ اس حکایت میں کتنی اصلیت ہے۔ سرحد کے قبائلیوں کے ساتھ ایسا ہو ہی نہیں سکتا' کیونکہ وہ الگ الگ لڑتے ہیں اور گوریلا جنگ کرتے ہیں' اور کشمیر میں تو انہوں نے سختی سے اس طریقہ پر عمل کیا کہ ایک ایک لاش کو چار سو میل پیچھے لے کر آگئے اور ان کے آبائی گھروں میں پہنچایا۔

ہماری طرف کا عالم یہ تھا کہ محاذ سے قبائلیوں کی اچانک غیر موجودگی کی خبر سن کر بعض لوگ سخت حیران ہوئے اور وہ محض اس لئے کہ نہ تو کوئی گھمسان کی لڑائی ہوئی تھی اور نہ کچھ بہت زیادہ جانی نقصان ہوا تھا۔

محاذ سے قبائلیوں کی واپسی کے عمل کو سمجھنے سے پہلے قبائلیوں کے طریقوں' اس زمانے کے حالات اور خود قبائلیوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ قبائلی اس قابل ہیں کہ انہیں سمجھا اور جانا جائے اس لئے بھی کہ انہوں نے کشمیر میں کیا کیا یا کرنے میں ناکام رہے بلکہ پاک بھارت تعلقات کے سیاق و سباق اور وسطی ایشیا میں رونما ہونے والی کسی بھی صورتحال کے حوالہ سے بھی انہیں جاننا ضروری ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے کے اعداد و شمار کے مطابق تقریباً دو لاکھ قبائلی مسلح تھے' ان کی تعداد میں اضافہ سے قطع نظر اہمیت کی بات یہ ہے کہ یہ کہاں ہوتے ہیں اور کون ہیں۔ سر اولف کیرو کے مطابق یہ لوگ دفاعی اعتبار سے اہم ایک ایسی پٹی پر بیٹھے ہیں جہاں ایشیا بلکہ دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک کے مقابلہ میں زیادہ بار حملے ہوئے۔ جہاں دھوپ اور ہوا جرات و ہمت پر ابھارتی ہے اور جہاں پتھریلی چٹانوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے متاثر کر دینے کی قوت سے مال مالا ہیں۔ (The Pathans, by Olaf Carse) ان میں سے بعض قبائل اس علاقہ میں تب سے ہیں جب تاریخ کا سفر شروع بھی نہیں ہوا تھا' یہ لوگ دارا کے زمانے (۵۱۰-۴۸۰ ق م) میں بھی یہاں تھے اور ہیروڈوٹس نے ان کا تذکرہ کیا اور انہیں ان علاقوں کے بہادر ترین لوگ

قرار دیا ہے۔ بعد کی صدیوں میں وہ مسلمانوں کے ہراول دستوں میں شامل ہوئے اور پہلے ہندوستان کی فتح کے وقت مال غنیمت سمیٹتے رہے اور بعد میں منتظم اور بادشاہ بنے ان سارے زمانوں میں پہاڑوں میں ان کی اپنی سرزمین کسی غیر ملکی حملہ آور کے زیر نگیں نہ آ سکی جہاں کبھی یہاں سے راستہ بنتا کبھی وہاں سے' کوئی پٹھان بادشاہ بھی ان پر غلبہ نہ پا سکا' یہی وجہ ہے کہ اس پٹی میں جو سکندر' چنگیز خان اور تیمور لنگ سمیت لاتعداد حملہ آوروں کی راہ میں تھی' ایک قبائلی معاشرہ قائم و دائم رہا' انفرادیت پسند اور اپنی آزادی کے لئے ہمیشہ لڑنے مرنے پر آمادہ۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں آج بھی دنیا کے بہترین سپہ گروں میں شامل کیا جاتا ہے' ان کے برطانوی حریفوں نے انہیں دنیا کے انتہائی سفاک دشمن قرار دیا تھا کیونکہ یہ اپنے دشمن کی جنگ میں حکمت عملی کی کسی ایک غلطی کو بھی معاف نہیں کرتے انہی میں سے وہ لوگ تھے جو کشمیر گئے' پھر کیا وجہ تھی کہ یہ لوگ ناکام ہوئے؟ دراصل ان کی ناکامیوں کے اسباب مظفر آباد سے آگے بڑھتے ہوئے ہی پیدا ہونے لگے تھے۔ ہر جنگی کارروائی سے پہلے' ان لوگوں کے یہاں طویل مشاورت کا ایک وسیع نظام موجود ہے۔ ان مشاورتی جلسوں میں تمام عوامل اور عواقب پر گہری سنجیدگی سے غور و خوض کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اگر ہر آدمی نہیں تو کم از کم ہر گروپ انفرادی طور پر اپنے مقررہ کام کو بخوبی سمجھتا ہے۔ اور اسے قبول کرتا ہے مظفر آباد پر اپنے شاندار حملہ کا اہتمام انہوں نے اسی طرح کیا تھا۔ یہ ان کا پہلا نشانہ تھا' لیکن اس کے بعد' معلوم یہ ہوتا ہے کہ اپنے اس معمول کے برعکس وہ ایک ہی ہلے میں آگے بڑھتے گئے۔ بارہ مولا تک تو یہ سلسلہ کامیابی سے جاری رہا' اور اگر ہندوستانی فوجوں کی آمد سے پہلے' وہ لوگ سری نگر پہنچ جاتے تو شاید یہ طریقہ اس حد تک بھی کامیاب رہتا' لیکن ہوا یہ کہ بارہ مولا میں جہاں سے سری نگر باآسانی پہنچا جا سکتا تھا۔ انہیں دو دن تک ٹھہرنا پڑا اور اس طرح انہوں نے بہترین موقع گنوا دیا۔ پھر بارہ مولا سے آگے یہ مہم رفتہ رفتہ کچھ ایسا کردار اختیار کرتی گئی جو ان کے خصائص اور طریق کار دونوں سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

قبائلی خود اپنے ملک میں دشمن کے خلاف چھاپہ مارتے اور گوریلا جنگ کرتے تھے' اگر یہ ان کی سرزمین ہوتی تو وہ اپنے ہولناک چھاپوں سے دشمن کی فوجوں کو مستقل طور پر خوفزدہ رکھتے' وہ پیچھا کر کے عقب کے فوجی دستوں کو' باقی فوج سے کاٹ کر الگ کر دیتے۔ وہ مخالف فوجی دستوں پر چھاپہ مارنے اور مواصلات کی تنظیم کے فن میں ماہر ہوتے ہیں۔ وہ

ایسی فوجی چوکیوں پر بھی حملہ کر سکتے تھے، جو دوسری چوکیوں سے دور اور الگ ہوں، لیکن دو باتیں وہ لوگ بالعموم نہیں کرتے۔ مخالف فوجیں اگر دفاعی پوزیشن میں ہوں تو یہ لوگ ان پر حملہ کرنا پسند نہیں کرتے۔ اور اسی طرح یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ دفاعی پوزیشن سنبھالکر بیٹھ جائیں اور مخالف فوجوں کو ان پر حملہ کرنے کا موقع مل جائے۔

یہ بات قدرتی تھی کیونکہ ایسی دونوں صورتوں میں فوج اپنی تنظیم، ڈسپلن اور بھاری اسلحہ کے اعتبار سے ان پر فوقیت رکھتی تھی، مورچہ بند فوج پر حملہ کرنا یا کسی فوج کے منظم حملہ سے کسی جگہ کا دفاع کرنا، دونوں صورتوں میں طویل اور شدید جنگ لڑنا پڑتی ہے۔ فوج یہ کام کر سکتی ہے کیونکہ جنگ کے دوران اس کی تنظیم میں گولہ بارود پہنچانا زخمی اور ہلاک ہونے والوں کو نکالنا اور راشن پہنچانا شامل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں وائرلیس فیلڈ ٹیلی فون، سگنل والے پرچم اور پیغام بروں جیسے بہترین انتظامات کے فوج کی کمان کہیں سے بھی کسی بھی وقت اور مطلوبہ مدت تک فوجیوں کو ہدایات دے سکتی ہے اور ان پر کنٹرول برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ فوجیوں کی یہ سبقت بھی ہوتی ہے کہ ان کے پاس مشین گن، برین گن، مارٹر، توپخانہ اور طیاروں جیسے بھاری ہتھیار بھی ہوتے ہیں، فوجیوں کو یہ بات راس آتی ہے کہ قبائلیوں کو اس طرح کی جنگ میں الجھا دیں مگر قبائلی اس سے زہر کی طرح پرہیز کرتا ہے۔ اس کے بجائے وہ اس طرح کے حالات کا منتظر رہتا ہے جن میں وہ اپنی صلاحیتوں کو کامیابی سے استعمال کر سکے سردست چونکہ وہ کسی مرکزی تنظیم سے پیوست نہیں ہوتا، لہٰذا جہاں اور جس وقت اس کا جی چاہتا ہے۔ لڑتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے فوراً جائے واردات سے غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ قبائلی کو صرف ایک رائفل اور ایک چاقو کا وزن اٹھانا پڑتا ہے۔ اور چونکہ جسمانی طور پر نسبتاً زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ اس لئے دوسرے کسی بھی فوج کے سپاہیوں کے مقابلہ میں زیادہ دور تک اور زیادہ تیز رفتاری سے دوڑ بھاگ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلسل گشت کرتا رہتا ہے۔ اور نہایت تحمل کے ساتھ موقع کا منتظر رہتا ہے، یہاں تک کہ اسے مناسب نشانہ مل جاتا ہے، اس کے بعد تو وہ بجلی کی طرح اپنے نشانہ پر جھپٹ پڑتا ہے۔ قبائلی اس بنا پر ایسی طویل اور مسلسل جنگی کارروائیوں سے کتراتا ہے جو اسے ایک جگہ پابند کر دیں اور صاف ظاہر تھا کہ سری نگر کے نواح میں بھی ہندوستانی فوجی دستوں کی مسلسل یورش کے بعد، اسے ایک ایسی ہی جنگی کارروائی میں الجھنا پڑتا۔

باقاعدہ فوج کے ساتھ جنگ میں قبائلی کو توپوں اور طیاروں کی گولہ باری سے بھی اپنا بچاؤ کرنا پڑتا ہے، اس بچاؤ کی صورت یہ ہے کہ وہ صرف شکستہ اور پہاڑی علاقوں میں جنگ

کرتا ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے بھی سری نگر کے نواح میں جنگی کارروائی کا معاملہ اسے غیر دلچسپ نظر آتا تھا کیونکہ بارہ مولا سے آگے سڑک کے دونوں طرف لق و دق میدان دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بارہ مولا سے آگے میدانی علاقہ کی اس دشواری کو دیکھتے ہوئے اگر ایک دوسرا لشکر سری نگر کے دوسری طرف بھیجا جاتا یا یہ فریضہ آزاد رضا کار انجام دیتے تو قبائلیوں کا کام کسی قدر آسان ہو جاتا' ہندوستانیوں کو اپنے عقب میں کسی طرح کے خطرے کے آثار نظر آتے تو وہ اصل لشکر کے خلاف پیش قدمی کرنے کے لئے شہر کو چھوڑنے کا خطرہ کبھی مول نہ لیتے۔ بلکہ قرین امکان یہ تھا کہ سری نگر کو چاروں طرف سے بچانے کے لئے وہ اپنی فوجوں کو نسبتاً زیادہ وسیع علاقہ میں بکھیر دیتے۔

۲۷- تاریخ کی رات میں جموں سے نپٹنے کا خیال بھی ترک کر دیا گیا اور نئی دہلی کو کھلی چھٹی دے دی گئی کہ اپنی ساری کارروائیاں' آزادی کے ساتھ سری نگر پر مرکوز کر دے۔ دو دن بعد ۲۹- اکتوبر کی رات میں سری نگر کے باہر جہاں چوتھے میل کا پتھر نصب ہے۔ قبائلیوں کو گھیر لیا گیا۔ اب یہ آخری موقع تھا کہ بکتر بند کار یا کسی اور بھاری اسلحہ سے' ان کے بچاؤ کی تدبیر کی جاتی' لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس کے بعد سے انہیں ایک ایسی مہم کی تکمیل کے لئے بے یارو مددگار چھوڑ دیا گیا' جو ان کی اہلیت سے باہر تھی۔

ہندوستانی فوجی دستے' اگرچہ ایک ایک گھنٹہ کے بعد برابر سری نگر میں چلے آ رہے تھے' اس کے باوجود قبائلیوں نے مزید چار پانچ روز تک شہر میں گھسنے کے لئے راستہ کی تلاش کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن اس کے بعد حالات کا بے تکا پن رفتہ رفتہ ان کی سمجھ میں آنے لگا ہو گا۔ جونہی یہ بات واضح ہوئی کہ سری نگر میں داخل ہونے کا کوئی امکان نہیں اور وادی میں کہیں اور ٹھہرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں کیونکہ یہ قیام موت کا جال ثابت ہو سکتا تھا اور اس کا متبادل فائدہ بھی کچھ نہ تھا تو انہوں نے وہی کیا جو قبائلیوں کا معمول ہے' یعنی اب اگر واپسی ہی ٹھہری تو انہیں تیزی سے واپس ہونا چاہیے' چنانچہ ابھی وہ لوگ سری نگر کے مضافات میں تھے اور دوسرے ہی لحہ چشم زدن میں غائب ہو گئے۔ قبائلیوں نے وادی کے میدانی علاقوں سے گزر کر بارہ مولا پہنچنے کے بعد ذرا توقف کیا۔ اس جگہ وہ لوگ ٹھہر سکتے تھے' بشرطیکہ بعض کم سے کم شرائط پیش کی جائیں۔ اور اگر وہ لوگ وہاں ٹھہر جاتے تو یہ امکان کم و بیش یقینی تھا کہ ہندوستانی انہیں وہاں سے ہرگز نکال نہ پاتے۔ ایسا نہیں کہ مدتوں۔ بلکہ کبھی بھی نکال نہ پاتے۔ لیکن کم سے کم شرائط کے نام پر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

قبائلیوں کا' خود اپنے علاقہ میں دستور یہ تھا کہ حملہ آور فوجی دستے پر سامنے سے اور

طرفین سے چھاپہ مارتے تھے۔ بیشتر اوقات' وہ بھرپور طاقت استعمال نہیں کرتے' بلکہ بہت حد تک شہد کی مکھی کا سا کام کرتے ہیں۔ جو اپنے دشمن کے جسم میں ڈنگ گاڑ کر اڑ جاتی ہے۔ اگرچہ ایک واقعی مضبوط دستے کو آگے بڑھ کر روکنا' ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا تھا پھر بھی وہ مخالفوں کو بھاری جانی نقصان پہنچاتے تھے اور طویل عرصہ تک ان کی پیش قدمی کو روکے رکھتے تھے۔ اگر حملہ آور دستہ کمزور ہوتا تھا تو وہ اکثر اسے روکے رکھنے میں یا پسپا کر دینے میں بھی کامیاب رہتے تھے۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ وہ چھاپہ مارنے' دشمن کو دہشت زدہ رکھنے اور جوابی حملہ کرنے کی کارروائی مسلسل جاری رکھتے تھے' کئی کئی دن تک اس شدت سے جاری رکھتے تھے کہ مخالف دستے کے لوگ تھک کر جواب دے جاتے تھے یا سپلائی اور کمک سے ان کا رابطہ ختم ہو جاتا تھا۔ یہ کارروائی خود اپنے ملک میں کرنا اس بنا پر ممکن تھا کہ ان کے لئے ہر وقت پہاڑیوں میں بکھر جانا آسان ہوتا تھا۔ جہاں ان کے اپنے ہی بھائی بند پناہ دیتے' خوراک اور اسلحہ مہیا کرنے اور زخمیوں کی طبی امداد کے لئے موجود ہوتے تھے۔

کشمیر میں اس طرح کے حالات نہ تھے۔ یہاں تو قبائلی ایک اجنبی ملک میں تھے اور وادی کے عوام ابھی مسلح جدوجہد کے لئے نہیں اٹھے تھے اور اس قسم کی امداد بہم پہنچانے کے لئے' نہ تو ان کے پاس وسائل تھے اور نہ یہ قرینہ ابھی انہوں نے سیکھا تھا۔ نتیجہ یہ کہ قبائلیوں کو اپنی تمام ضرورتوں کی تکمیل کے لئے سڑکوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا' جہاں سے بہت دور ہٹ کر چلنا ان کے لئے ممکن نہ تھا اور قریب رہنے میں ان کی حفاظت کا انتظام ضروری تھا۔ لہٰذا اس مرحلہ پر انہیں سڑک کے پار کوئی دفاعی مورچہ درکار تھا جو ان کے لئے بیس کیمپ کا کام کر سکے جن کے پیچھے وہ لیٹ سکیں اور جہاں سے وہ دوبارہ نکل کر حملہ کر سکیں اپنے عمل اور مزاج کے اعتبار سے یہ ان کا کام نہ تھا سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کرکے خندقوں میں بیٹھنا بلا شبہ ان کا نہیں' دوسروں کا کام تھا' سابق فوجیوں کی کوئی جمعیت کسی اچھے قائد کی رہنمائی میں سڑک بند کر سکتی تھی مگر اس کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا بلکہ کسی کو اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

واپسی میں قبائلیوں کو کوئی ایسی جگہ نہ ملی جہاں وہ آسانی سے سڑک پر اپنی بسیں چھوڑ جاتے اور جہاں وہ پہاڑوں میں گم ہو جاتے اور بھارتی فوج کے کسی دستہ کے آنے پر نمودار ہوتے اور اگر وہ پہاڑوں میں اگلی لڑائی کے لئے چھپ نہ سکتے تو پھر ان کا اپنی بسوں میں بیٹھ کر انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا وہ کشمیر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے مگر وہ کہیں اور جا

کر اطمینان کے ساتھ انتظار کر سکتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان نے انہیں نیچا دکھایا ہے۔ وہ اپنی مرضی کے خود مالک تھے وہ اپنی مرضی سے ریاستی فوج کے خلاف جنگ کی غرض سے آئے تھے اور ایسے میں انہوں نے وہ کچھ کر دکھایا تھا جس کی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی مگر ان کے ساتھ کسی اور نے یہ انتظار نہ کیا کہ اگر بھارت کی باقاعدہ فوج توپوں ٹینکوں اور طیاروں کے ساتھ آ جائے تو کس طرح جنگ جاری رکھی جائے گی۔

اس پر بھی انہوں نے بھارتی فوج کی آمد پر ایک لمحہ کے لئے بھی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ کیا اور جنگ جاری رکھ کر کئی کامیابیاں حاصل کیں مگر یہ قدرتی بات ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں انہیں پاکستانی فوج کی امداد کی توقع تھی جلد ہی انہیں یہ دھچکا لگا کہ کوئی فوج، کوئی توپخانہ کوئی طیارہ ان کی مدد کے لئے نہیں پہنچ رہا، حتیٰ کہ ان کے عقب میں کسی محفوظ اڈے کا انتظام بھی نہ کیا گیا۔ اس طرح ۵ نومبر کی رات تک قبائلی لشکر کا بڑا حصہ سری نگر سے ۶۵ میل اور بارہ مولا سے ۳۰ میل دور اوڑی میں پسپا ہو چکا تھا۔ اور وہاں بھی صورتحال کوئی مختلف نہ تھی اگلے روز تک چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں انہوں نے کشمیر سے نکلنا شروع کر دیا تھا۔

یہ وہ حالات تھے جب میں ۷ نومبر کو راولپنڈی سے محاذ کی جانب روانہ ہوا۔

باب ۸

سرتوڑ کوششیں

مظفر آباد سے ۳۰ میل آگے، ایک جگہ پوری سڑک پر رکاوٹ کھڑی ہوئی تھی، یہ دیکھ کر مجھے رکنا پڑا۔ اچانک اندھیرے میں کسی نے زور سے آواز دی "کون ہے؟" چناری ڈاک بنگلہ کی بم سے تباہ شدہ عمارت کے خطوط اندھیرے میں نمایاں تھے، کوئی آدھے درجن آدمی اس کے کھنڈر سے جست لگا کر سڑک پر آ گئے یہ سوات آرمی کے جوان تھے۔

قبائلی علاقوں کے لوگوں کے برعکس یہ خوش پوش بھی تھے اور نرم خو بھی۔ ان کے ڈپٹی کمانڈر کیپٹن رشید نے بتایا کہ ہماری تعداد تین سو ہے اور ہم لوگ باغ کی ریاستی چوکی کو آزاد کرانے کی کوشش میں مدد دینے کے بعد مضافات سے ابھی ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ وہاں کھڑے کھڑے میں نے بھی ان کی قدیمی کار، جس پر جھنڈا لگا ہوا تھا۔ پہچان لی چند روز پہلے سری نگر جاتے ہوئے، میں نے اسے دیکھا تھا۔ اچھا تو اس کار میں یہ لوگ بیٹھے تھے۔

سری نگر میں پسپائی

سری نگر میں جس پسپائی کا سامنا کرنا پڑا تھا، رشید کو اس کی پوری طرح خبر نہ تھی۔ میں نے صورت حالات کی وضاحت کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ کیا تم آگے جانا چاہو گے جہاں تمہاری مدد کام آ سکتی ہے۔ رشید آمادہ تھا اس نے وعدہ کیا کہ اگر کمانڈر نے اجازت دی تو ضرورت پڑنے پر میں اپنے آدمیوں کو ساتھ لے کر آگے جاؤں گا۔ اس نے کہا کہ میں آپ کے پیغام کا انتظار کروں گا۔

اوڑی جاتے ہوئے۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں کی موجودگی واقعی بڑی خوش بختی ہے۔ ان کے بارے میں تو مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں تھا۔ شاید کسی کو کشمیر میں ان کی موجودگی کا علم ہی نہ تھا۔ رشید کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ خاصے جوش میں ہے، حالانکہ اس علاقہ کی صورتحال کے بارے میں مجھے جو تاثر دیا گیا تھا۔ یہ بات اس سے قطعی مختلف تھی۔

کوئی آدھی رات کا عمل تھا۔ جب میں اوڑی پہنچا یہاں پہنچتے ہی' میں نے لشکر کے کمانڈر خورشید انور کو تلاش کرنا شروع کیا۔ اس سارے علاقہ میں گھور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سڑک پر کوئی رکاوٹ نہ تھی اور نہ کوئی مزاحمت کرنے والا بظاہر وہاں موجود تھا۔ سڑک کے قریب تمام عمارتیں یا جل چکی تھی یا بمباری سے تباہ ہو چکی تھی۔ کہیں کہیں کچھ لاریاں کھڑی تھیں ان کے ڈرائیور کوئی مفید مطلب اطلاع دینے سے معذور نظر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ قبائلی تو یہاں موجود ہیں' لیکن خورشید انور کے بارے میں ہمیں کوئی خبر نہیں۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ اب کوئی چارہ نہیں' میں نے پہاڑی کے دامن میں کھڑی ہوئی جھونپڑیوں میں سے ایک ایک کے اندر جھانکنا شروع کر دیا۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد میجر اسلم جان سے (جو بعد میں بریگیڈیئر بن گئے) میری مڈ بھیڑ ہو گئی۔ وہاں بطور رضا کار آئے تھے۔ اور مجھے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ میری طرح' ان کے کمانڈ میں بھی کوئی نہ تھا' البتہ کچھ اطلاعات ان کے پاس تھیں۔ معلوم ہوا کہ اسی روز کچھ دیر پہلے یا ممکن ہے اس سے ایک رات پہلے ایک ہندوستانی بریگیڈ بارہ مولا پہنچا تھا۔ لہٰذا ہندوستانی بریگیڈ اور اوڑی میں مقیم قبائلیوں کے درمیان اب تقریباً ۳۰ میل کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

میں نے یہ اندازہ کیا کہ بارہ مولا اور اوڑی کے درمیان کا یہ علاقہ قبائلیوں کی سرگرمیوں کے لئے بہترین ہے یہ علاقہ تمام تر پہاڑی ہے اور صرف ایک پتلی سی سڑک اس کے درمیان سے گذرتی ہے۔ یہی سڑک جسے ہندوستانیوں کو آگے بڑھنے کے لئے استعمال کرنا پڑے گا۔ دونوں طرف سے بند تھی۔ اس کے ایک سرے پر دریائے سندھ بہتا ہے جو نہایت گہرا اور طوفانی دریا ہے اور اسے پار کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ سوائے اس کے کہ ایک فٹ کا پل استعمال کیا جائے جو بارہ مولا اور اوڑی کے درمیان نصف فاصلہ پر واقع ہے۔ اور اس سڑک کے دوسری طرف بلند اور ڈھلوان پہاڑیاں ہیں' جو' درختوں اور جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ یہ سڑک سیدھی نہیں بلکہ خاصی پر پیچ تھی' اس میں ہر دو سو تین سو گز کے فاصلے پر کوئی نہ کوئی موڑ آ جاتا تھا۔ اور کم و بیش ہر آدھ میل کے بعد ایک تنگنائے آ جاتا تھا اور ہر دو یا تین میل کے فاصلہ پر ایک پل۔

قبائلیوں کو دور رکھنے کا طریقہ

فوجوں کو اور ان کے ساتھ توپوں اور بھاری گاڑیوں کو اس سڑک پر سے بحفاظت

گذارنے کے لئے ہندوستانیوں کو یہ انتظام کرنا پڑے گا۔ کہ قبائلی کو اتنی دور رکھیں کہ اس جگہ سے ان کی گولیوں کی باڑھ کا اور چھاپے کا ڈر نہ رہے۔ اور یہ علاقہ ایسا نہ تھا' جہاں معمول کے طریقہ سے سڑک کے دونوں طرف اپنے موقع کی جگہ چھانٹ کر فوجی چوکیاں قائم کر دینے سے یہ تحفظ حاصل ہونے کا امکان ہوتا۔ نہ تو یہ پہاڑ اتنے صاف اور چٹیل تھے۔ اور نہ سڑک اتنی سیدھی تھی کہ حفاظت کے لئے معمول کا طریقہ اختیار کیا جاتا۔

اس مقام پر جہاں سڑک اتنی پر پیچ اور پہاڑیاں درختوں سے خوب ڈھکی ہوئی تھیں' قبائلیوں کو دور رکھنے کا طریقہ یہی تھا کہ سڑک کے دونوں طرف کی تمام پہاڑیوں پر عملاً پورا پورا قبضہ جما لیا جائے۔ لیکن ایسا کرنے کے لئے' جب کہ قبائلی بھی وہاں پہلے سے موجود تھے' میرے خیال کے مطابق ہندوستانیوں کو بہت بڑی فوج استعمال کرنی پڑتی اور اتنی بڑی فوج ان کے پاس وہاں کہاں تھی' اور جہاں تک ان کے ایک بریگیڈ کا تعلق تھا صرف دو تین سو محسود اسے مسلسل کئی ہفتے تک اپنی جگہ پر روکے رکھنے کے لئے کافی تھے۔ اس کے باوجود قبائلی یہ کارروائی کرنے کے لئے آگے نہیں آئے اور نہ یہ ہوا کہ لاتعداد پلیوں اور پلوں میں سے کسی ایک کو بھی تباہ کیا گیا تاکہ ہندوستانیوں کی پیش قدمی میں تاخیر پیدا ہوتی۔ رضا کاروں کا صرف ایک چھوٹا سا گروپ جو پہلے انڈین نیشنل آرمی۔ آئی این اے میں شامل تھا۔ دشمن سے کچھ دور سڑک پر کھڑا اور پہرے کی چوکی کے طور پر کام کر رہا تھا۔

ظاہر ہے' اس وقت پہلے کام کرنے کا یہ تھا کہ کہیں سے کوئی پل تباہ کر دیا جائے تاکہ اوڑی جانے کے لئے ہندوستانیوں کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہو۔ کچھ توڑ پھوڑ کا مصالحہ اور چند آدمی اس کام کے لئے درکار تھے' جب تک آدمی اکٹھا کئے جاتے میں نے سوات آرمی کے رشید کو اطلاع بھجوائی کہ اپنے آدمیوں کو لے کر فوراً آگے بڑھے تاکہ دوسری صبح وہ لوگ دفاعی پوزیشن سنبھال کر ڈٹ جائیں۔ اس کے بعد میں قبائلی لیڈروں سے ملاقات کروں گا سواتی جوان ویسے تو اتنے ہی جنگ جو اور بہادر ہوتے ہیں۔ جتنا کوئی دوسرا ہوتا ہو گا۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم تھا' ان کی موجودہ نسل باقاعدہ فوجوں کے مقابلہ میں دو بدو جنگ کا کوئی تجربہ نہیں رکھتی تھی۔ لہٰذا محسود اور آفریدی جو کچھ کر سکتے تھے' اس کی توقع' ان لوگوں سے نہیں کی جا سکتی تھی' پھر بھی' میں نے سوچا کہ اپنا دفاعی کردار یہ لوگ سلیقے سے انجام دے لیں گے۔

کچھ دیر بعد ہم آگے بڑھنے کے لئے تیار تھے۔ توڑ پھوڑ کرنے والے اوزار یا ڈائنا مائیٹ اور اس طرح کی دوسری چیزیں موجود نہ تھیں۔ البتہ باٹیوں میں کچھ پٹرول اور کیلیں

مل گئیں تھیں، ایک درجن رضا کار آ گئے تھے اور خوش قسمتی سے انہی میں ایک سپر بھی موجود تھا۔ یہ ایک پنشنر نائیک (کارپورل) تھے، جو اپنی ۱۸۔ ۱۹۱۴ء کے جنگ کے زمانہ کی برجیس پہنے ہوئے تھے۔

ایک لاری لے کر ہم سب اکٹھے بارہ مولا کی طرف روانہ ہو گئے۔ سب کی نظریں سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ تاکہ یہ نہ ہو کہ ہم لوگ بھول چوک میں دشمن کی چوکی کے قریب پہنچ جائیں کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ یہ احتیاط بیکار ہے، ایک گاڑی سڑک پر نہایت تیزی سے دوڑتی ہوئی۔ دشمن کی جانب سے ہماری طرف آئی۔ معلوم ہوا کہ ہندوستانی فوج کا ایک ٹرک ہے، جسے کوئی محسود قبائلی چلا رہا ہے۔ بظاہر اس پر یہ افتاد گذری کہ جب پیچھے اکیلا رہ گیا تو ایک جگہ گھات میں چھپ کر بیٹھ گیا اور موقع پاتے ہی ایک ٹرک ڈرائیور کو خنجر مار کر اسے ٹھنڈا کر کے اور ٹرک اس سے چھین کے، نہایت بہادری کے ساتھ دشمنوں کے درمیان سے دندناتا ہوا ہماری طرف آ گیا۔ قبائلی کا کہنا تھا کہ دشمن آگے نہیں بڑھ رہے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں کوئی ایک پل تباہ کرنے کے لئے خاصہ وقت مل جائے گا۔

بارہ مولا سے کچھ دور ایک مناسب سا پل دیکھ کر آدمیوں نے اس پر کام شروع کیا۔ دن نکلنے تک پل میں کم از کم اتنا بڑا شگاف تیار ہو گیا تھا کہ گاڑیاں اب ادھر سے نہیں گذر سکتی تھیں۔ لیکن وہ نالہ، جس پر پل بنا تھا، بجائے خود زیادہ گہرا نہیں تھا اور اس کے کنارے بھی اتنے ڈھلوان نہ تھے کہ گاڑیوں کے لئے راستہ بدل کر ادھر سے گذرنے میں رکاوٹ ہوتی۔ لہٰذا ضروری تھا کہ کچھ لوگوں کو یہاں چھوڑ دیا جاتا۔ تاکہ جب دشمن ادھر آتے تو وہ چھپ کر ان پر حملہ کرتے۔ مجھے توقع تھی کہ یہ لوگ اگر پختگی سے اپنے ارادے پر قائم رہے تو ہمارے لئے چند گھنٹوں کی یا شاید پورے دن کی مہلت ضرور حاصل کر لیں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ موجودہ حالات میں یہ امکان شک سے خالی نہ تھا۔ جب فضا میں پسپائی کی بو رچی ہوئی تھی اور محاذ پر متعین لوگوں کو اندیشہ تھا اور یہ اندیشہ کسی حد تک درست تھا کہ دوسرے لوگ تو رخصت ہو جائیں گے اور انہیں بیچ مصیبت میں ڈال جائیں گے۔

پل کی طرف سے واپسی میں دفاعی پوزیشن لینے کے لئے میں نے ایک اچھی سی جگہ منتخب کر لی، جس کے متعلق میرا خیال تھا کہ سواتی، جب ادھر آئیں گے تو اس جگہ کو پسند کریں گے۔ میرا یہ احساس تھا کہ اس جگہ، وہ لوگ ہندوستانیوں کو کئی دنوں تک روکے

رہیں گے۔ انہیں ٹیلیفون پر پیغام بھجوایا دیا گیا تھا' کیونکہ پرانی ٹیلیفون لائن' سڑک کے ساتھ ساتھ ابھی تک موجود تھی فاصلہ بھی محض چالیس میل تھا' اس لئے میں یہ امید کرتا تھا کہ رشید اب کسی بھی لمحہ پہنچنے ہی والا ہے۔ لیکن یہ امید عبث تھی۔ رشید نہیں آیا۔ اس کے بجائے اس مضمون کا پیغام ملا کر سواتیوں کا کمانڈر جو سوات گیا تھا' ابھی تک واپس نہیں آیا۔ تاہم ایک آدمی کو سوات بھیجا گیا ہے تاکہ اس سے اجازت لے آئے۔ بد قسمتی سے سوات کا فاصلہ تین سو میل تھا۔ لہٰذا اب کیا ہو سکتا ہے۔

اوڑی واپس ہونے کے بعد اب وقت تھا کہ قبائلیوں اور ان کے سرغنوں سے ملاقات کی جائے۔ قبائلی امور کے سیکرٹری کرنل اے ایس بی شاہ جنھوں نے ان لوگوں سے مجھے متعارف کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ ابھی خود ہی وہاں نہیں آئے تھے۔ اب وہ ساتھ ہوں یا نہ ہوں۔ مجھے تو بہرحال ان لوگوں سے ملنا ہی تھا میں خود بھی پٹھان ہوں۔ اس لئے ان سے ملنے میں' مجھے کسی خاص دشواری کا احتمال نہ تھا اور میں ان کے جنگی طریقوں سے بھی واقف تھا کیونکہ دس سال پہلے' برطانوی ہند کے ایک فوجی افسر کی حیثیت سے' میں ان کے خلاف قبائلی علاقہ میں دو برس تک ایک لڑائی میں شریک رہا تھا۔ لیکن یہاں تو میں' ان میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔ اور نہ وہ مجھے جانتے تھے لہٰذا ہماری ملاقات یونہی ہونی تھی۔ جیسے اجنبی' اجنبی سے ملتے ہیں' اور وہی ہوا کہ انہوں نے سوالوں کی بوچھاڑ سے مجھے زچ کر دیا۔ سوال ہوا کہ میں کون ہوں؟

میں نے اس کا جواب دے دیا۔

کیا پاکستانی حکومت نے تمہیں بھیجا ہے؟

نہیں۔

کیا مدد کے لئے کوئی فوج پیچھے آ رہی ہے؟

نہیں۔

کیا تم اسلحہ یا گولہ بارود ساتھ لائے ہو؟

نہیں۔

پاکستان کشمیر چاہتا ہے یا نہیں چاہتا؟

ہاں۔

اگر ایسا ہے تو پاکستان نے محاذ پر اپنے توپ خانے اور طیارے کیوں نہیں بھیجے' جیسا کہ ہندوستان نے بھیجے ہیں' اور فوج وہاں کیوں نہیں پہنچی؟ آخر انہیں اسی خدمت کا

معاوضہ ملتا ہے

میں نے قانونی موقف کی صراحت کرنی چاہی- لیکن یہ بات سرے سے فضول تھی- ان کا سوال یہ تھا کہ پھر میں یہاں کس لئے آیا ہوں؟- کیا محض انہیں مشورے دینے کے لئے؟

میں نے جواب دیا کہ جی نہیں- میں یہاں آپ لوگوں کو مشورہ دینے نہیں آیا ہوں- میں بھی آپ ہی کی طرح صرف ایک رضا کار ہوں- میں نے انہیں بتایا کہ مسلمان اور پاکستانی ہونے کے رشتے سے کشمیر کا مسئلہ ہمارے لئے کیا معنی رکھتا ہے- اس کے بعد میں نے بتایا کہ ہم پٹھان لوگ کون ہیں؟ ہم یہاں کس مقصد کے تحت آئے ہیں' ہم سے توقع کیا کی جاتی ہے- اور خود ہمارے وقار کے تقاضے کیا ہیں؟ میں خود اپنی تقریر کے اثر سے جوش میں آتا جا رہا تھا لیکن دفعتاً" مجھے احساس ہوا کہ دوسری طرف کوئی ٹس سے مس نہیں ہوتا- اگرچہ بہت سے لوگ مروت کے مارے اثبات میں سر ہلا رہے تھے' لیکن اس طرح کی باتیں وہ پہلے بھی سن چکے تھے- محسوس یہ ہوتا تھا کہ ایسی باتوں کا وقت اب گذر چکا ہے اور اگر ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا تو یہ بھی کچھ بے سبب نہیں-

میں ان سے یہی تو کہہ رہا تھا کہ جو لڑائی انہوں نے ابھی بند کی ہے' اسے از سر نو شروع کریں اور میں اس جنگ کے لئے انہیں اس طرح آمادہ کر رہا تھا کہ صورت حال میں نہ تو اپنی طرف سے کسی امداد کا اضافہ کر رہا تھا اور نہ انہیں کسی بات کا یقین دلا رہا تھا- اس وقت تک وہ یہ ضرور محسوس کرنے لگے ہوں گے کہ عجب طرح کے آدمی سے سابقہ پڑا ہے- لہٰذا اب اس قصہ کو یہیں ختم کرو- لیکن بات محض اتنی ہی نہیں تھی- میں حکومت کا نمائندہ نہیں تھا' اور نہ میں فوج کا نمائندہ تھا' یہاں تک کہ کسی سیاسی پارٹی یا قبیلہ کی نمائندگی بھی میرے ذمہ نہ تھی اور پھر یہ کہ میرے پاس کوئی اسلحہ' گولہ بارود کا کوئی ذخیرہ اور پیسہ دھیلا بھی نہیں تھا-

تاہم معاملات کو یوں تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا- ایک سپاہی کی حیثیت سے اور اپنے کام کے طریقے جانتے ہوئے' مجھے اس امر کا یقین تھا کہ ان پہاڑیوں کے درمیان بندوقوں اور طیاروں کے استعمال سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا اور یہ کہ قبائلیوں کی اس سے کم تعداد بھی' اپنی ایک ایک رائفل کی مدد سے ہندوستانی فوجوں کی پیش قدمی روک سکتی تھی- یہی بات میں نے ان سے کہی اور بالآخر مجھے اندازہ ہوا کہ اس بات سے ان میں کچھ تھوڑی سی دلچسپی پیدا ہوئی- جنگی حکمت عملی پر بحث مباحثہ انہیں پسند آتا ہے اور اب رفتہ رفتہ انہیں

یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس بارے میں کچھ تھوڑا بہت علم مجھے بھی ہے۔

اس وقت اوڑی میں جو لوگ موجود تھے' ان میں وزیرستان سے آنے والے بہت سے محسود اور تیراہ کے آفریدی بھی شامل تھے۔ یہ لوگ بہترین سپاہی ہوتے ہیں' لیکن فی الوقت جم کر لڑنے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ اب جو باقی بچے' ان میں پشاور اور مردان کے قصباتی علاقوں کے بہت سے پٹھان تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ میرا بڑا بھائی بھی انہی کے درمیان موجود ہے۔ بہرحال ان میں سے بہت سے لوگ صرف شاٹ گن' پستول اور ایسے ہی معمولی اسلحہ سے نیم مسلح تھے' لیکن چونکہ وہ تعاون پر آمادہ تھے' لہٰذا میں نے ان کے ذمہ یہ کام سونپا کہ کیمپ کی رکھوالی کرتے رہیں اور اپنے آدمیوں کو پہاڑیوں پر بٹھا دیں' جو طیاروں کو تاک کر گولی کا نشانہ بنائیں۔ یہ بات تو تھی کہ وہ طیاروں کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے' پھر بھی' مجھے یہ خیال تھا کہ ایسا کرنے سے ان میں جنگ آزمائی کا جذبہ پیدا ہو گا اور ہندوستانی پائلٹوں کو بھی پتہ چل جائے گا کہ ان کی مزاحمت کی جا رہی ہے۔

اس سے کچھ تھوڑا سا فائدہ ہوا۔ کئی گھنٹہ کی کاہلی اور بے عملی کے بعد' جب درپیش ہونے والے ایک کام کا خیال ذہنوں میں آیا تو اس سے فوراً پورے کیمپ میں سرگرمی کی لہر سی دوڑ گئی۔ دوسری بار طیارہ' جب ہمارے سروں پر منڈلاتا ہوا آیا تو ہم میں سے کچھ لوگوں نے کیمپ کے وسط سے ہی اسے تاڑنا شروع کیا اور بہتوں نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اسے جواب میں گولی کا نشانہ بھی بنایا آدھ گھنٹہ بعد' جب کہ ہمارے درمیان جرح بحث ابھی جاری تھی' فضا میں تین طیارے گھومتے ہوئے آئے' ان کا مقابلہ نہایت بہادری کے ساتھ کیا گیا۔ اگرچہ طیاروں نے کچھ لوگوں کو زخمی بھی کیا اور جھونپڑی سمیت' اس ساری جگہ پر گولیوں کی اچھی طرح سے بوچھار کی۔ یہ وہی جھونپڑی تھی' جسے میں نے اپنے ہیڈ کوارٹر کے طور پر منتخب کیا تھا۔

مجھے اس وقت خیال گذرا کہ اس چھوٹے سے واقعہ سے بھی اچھا اثر پیدا ہوا ہے۔

اب جنگ کی کیفیت' رفتہ رفتہ سارے ماحول میں رچنے لگی تھی۔ صورت حالات کی فوری اور ہنگامی اہمیت تو ظاہر ہی تھی اور میں اس وقت قبائلیوں پر زور دے رہا تھا کہ جلد از جلد حتمی طور پر فیصلہ کر لیں۔ خورشید انور وہاں سے پہلے ہی جا چکے تھے' اور اب ان لوگوں کو خود ہی سوچ کر کوئی بات طے کرنی تھی۔ جب دوپہر ہونے کو آئی تو قبائلی سرداروں نے اپنے آدمیوں کے ساتھ مشورے کی خاطر مزید مہلت طلب کی! البتہ یہ دیکھ کر خوش ہوئی کی فی الوقت ایک محسود سردار خونے خان نے اپنے انیس آدمیوں کے ساتھ' میرے ہمراہ چلنے کے

لئے اپنی خدمات پیش کر دیں، تاکہ ٹوٹے ہوئے پل پر متعین ہماری جماعت کو فوراً مدد مل جائے کیونکہ یہ کام فوری اہمیت کا تھا۔

چنانچہ ایک بار پھر ہم بارہ مولا کی طرف واپس ہوئے ۲ بجے سہ پہر کا وقت تھا، جب پل دکھائی دینے لگا۔ یہاں سے ہم نے دیکھا کہ ایک ہندوستانی بکتر بند گاڑی پل کے دوسری طرف آ کر رک گئی ہے البتہ کچھ پیدل دستے نے پل پار کر لیا ہے اور پہاڑی کی جانب بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ ہمارا سیپر (Sapper) اور اس کے آدمی اب تک وہیں موجود تھے اور خونے خان کی جمیعت بالکل بر وقت مدد کے لئے پہنچی تھی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں قبائلیوں کو اتنے قریب سے بر سر جنگ دیکھ رہا تھا۔ پیدل دستے کا جو بھی سالار انہیں اس رنگ میں دیکھتا ضرور اس کا دل بھی خوشی سے جھوم جاتا۔ ہم لوگ سالہا سال تک اپنے فوجیوں کے اندر جو بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ان کی گویا عادت ثانیہ ہوتی ہے۔ ان کا زمین پر نظریں گاڑنا، ان کا فوراً منتشر ہو جانا، ان کی تیزی اور پھر چھپنے کی اہلیت یہ سب خصوصیات عین کتاب کے درس کے مطابق تھیں۔

اگرچہ اس کے چند ہی ثانیوں کے اندر ایک طیارہ گولیوں کی باڑھ چلاتا ہوا آ پہنچا اور پھر ادھر ادھر بم برسنے لگے، لیکن قبائلی یہاں سے پہلے ہی خاصی دور نکل چکے تھے۔ ہمارے بائیں جانب، دریا پر پیدل گذرنے والوں کا ایک پل دیکھ کر، قبائلیوں کی نصف تعداد تو تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف لپکی اور چٹانوں کی آڑ لے کر دریا کے کنارے کنارے بھاگتی گئی۔ یہ ایک اچھی چال تھی، کیونکہ ہندوستانی فوج ابھی تمام کی تمام اسی طرف تھی اب قبائلی ایک طرف سے انہیں جا لیں گے۔ چند ہی منٹ گذرے تھے کہ ان کی گولیوں کی باڑھ شروع ہو گئی اور یہ حملہ آگے آنے والی ہندوستانی فوجوں پر تین طرف سے ہوا تھا، ایک تو سامنے سے، باقی دونوں پہلوؤں سے۔ ہندوستانیوں نے اپنے مخالفین کی تعداد کا اصل سے کہیں زیادہ قیاس کیا ہو گا، چنانچہ انہوں نے پیش قدمی روک دی۔

میرا خیال تھا کہ ہندوستانی، اس جگہ پر دیر تک ٹھہرے رہیں گے، کیونکہ قبائلیوں کی موجودگی نے انہیں بے حد محتاط بنا دیا ہو گا اور قرین امکان یہ ہے کہ غروب آفتاب کے وقت یہ لوگ قبائلیوں کے چھاپے کے ڈر سے، پل کے پیچھے واپس ہو لیں گے اور اس کے بعد دوسری صبح، یہ لوگ سب سے پہلے ایک دستہ گشت کے لئے بھیجیں گے، پھر کہیں فوجی معمول کے مطابق حملہ کا مناسب منصوبہ تیار کریں گے۔ خوش قسمتی سے اس دوران میں، ہمیں پورے ۲۴ گھنٹے کی مہلت مل جائے گی اور اس وقت تک ہم اپنی پوزیشن سنبھال چکے

ہوں گے۔

یہی کچھ سوچ کر میں یہ معلوم کرنے کے لئے اوڑی واپس ہوا کہ قبائلیوں کے صلاح مشورہ کی صورت کیا ہے۔ وہاں بدستور کھینچا تانی ہو رہی تھی' ایک پل میں وہ لوگ جنگ پر آمادہ نظر آتے تھے۔ اور دوسرے ہی لحہ میں جنگ سے انکاری' ان کی اصل دلیل اب تک یہی تھی کہ مدافعت کی کوئی محفوظ صورت نہ ہونے سے ہم لوگ بد دل ہو چکے ہیں۔

ہندوستانی فوج سورج ڈوبنے تک ابھی شکستہ پل کے پاس ہی کھڑی تھی' یہ جگہ پاکستانی سرحد سے شاید ۷۵ یا ۸۰ میل دور ہو گی۔ جوں ہی اندھیرا ہوا ہمارے رضا کار اور خونے خان کے علاوہ اس کے ساتھی پیچھے واپس ہوئے۔ کیونکہ وہاں وہ لوگ تنہا رہنا نہیں چاہتے' نتیجہ یہ کہ دشمن کے سامنے کوئی بھی موجود نہیں رہ گیا تھا۔

اس وقت اوڑی میں' ہر شخص کے ذہن میں سب سے پہلے ایک ہی خیال آتا تھا کہ کشمیر سے پوری طرح دستبردار ہو لیا جائے۔ یہ بات اب قطعی ناگزیر نظر آتی تھی اور ہر شخص جانے کے لئے بے چین تھا سورج ڈوبتے ہی گھنٹہ بھر کے اندر اندر بیشتر افراد' اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔ جو باقی بچے' وہ بھی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں اب تک یہ امید کر رہا تھا کہ شاید ایک سو کے قریب لوگ ٹھہر جائیں۔

ادھر ادھر کے آئے ہوئے ایک سو افراد کا ہجوم جو محض رائفلوں سے مسلح ہو' جس کی کوئی فوجی ڈسپلن نہ ہو' اور جس کے کوئی قبائلی رشتے نہ ہوں' ہندوستان کے باقاعدہ فوجی دستوں کا حریف ثابت نہیں ہو سکتا' جس کے پاس شاید ہزار سے زیادہ جوان ہوں گے آگے آگے بکتر بند کاریں ہوں گی' اور ان کی مدد کے لئے توپ خانے اور طیارے ہوں گے۔ اس کے باوجود' میں ان ایک سو آدمیوں کو پا کر بھی خوش رہتا کیونکہ اس علاقے کے حالات مخالف فوجوں کو الجھانے اور جنگ کو طول دینے کے لئے ساز گار تھے اور اگر ہمیں کچھ تھوڑی سی مہلت مل جاتی تو اس دوران میں لازماً امداد پہنچ جاتی۔

لیکن معلوم ہوتا تھا کہ یہ امید بھی پوری نہیں ہو گی۔ قبائلیوں کی واپسی کا سلسلہ جاری رہا اور اس کے ساتھ ہی ہماری امیدیں بھی رخصت ہو رہی تھیں۔ اوڑی' نہایت تیزی سے ایک اجاڑ قریہ کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا' جس میں شکستہ جھونپڑیوں اور آوارہ کتوں کے سوا کسی شے کا وجود نہ تھا۔

اوڑی میں غالباً ایک ہزار سے کچھ زیادہ لوگ رہے ہوں گے۔ بعض لوگوں نے یہ امید بندھائی تھی کہ ہم سے تعاون کریں گے' جنہوں نے وعدے وعید کئے تھے' اور ان میں

سے بعض تو اپنی لاریوں میں بیٹھ کر دشمن کی طرف چل پڑے تھے، لیکن پھر انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور واپس ہو لئے۔ اب یہ سب لوگ اوڑی سے نکل نکل کر جا رہے تھے۔ ان میں بمشکل چند ہوں گے، جنہوں نے اپنی روانگی کے آخری لمحہ میں کچھ تشویش اور استعجاب ظاہر کیا تھا، یعنی یہ کہ

کیا یہ مناسب نہیں کہ اب مجھے بھی واپس چلنا چاہیے؟

کیا ان لوگوں کے جانے کے بعد بھی میرا ارادہ وہاں ٹھہرنے کا ہے؟

میرے وہاں ٹھہرنے کا فائدہ کیا ہو گا؟

لیکن تشویش بس اتنی ہی تھی، اس سے زیادہ نہیں وہ خود وہاں مزید ٹھہرنے کے روادار نہ تھے۔ گھر کی طرف واپسی کا ریلا تیز ہوتا جا رہا تھا۔ اب انہیں سخت عجلت تھی، لیکن وہ سب آن کی آن میں رخصت ہو گئے۔

رات کے نو بجے تھے، جب رخصت ہونے والی آخری گاڑی کی پچھلی بتیاں دور اندھیرے میں گم ہو گئیں۔ اب میں نے جائزہ لینا شروع کیا کہ باقی کیا رہ گیا ہے۔ اس دوران میں پتہ چلا کہ یہ اسٹاف آفیسر تسکین الدین وائرلیس سیٹ کے ساتھ خود بھی اسی بھیڑ بھاڑ میں جا چکا ہے، کوئی درجن بھر آدمیوں کے سوا، وہاں کچھ بھی تو نہیں رہ گیا تھا۔ رضا کار، قبائلی اور دوسرے پٹھان، بھی جا چکے تھے۔ اسی طرح کچھ دیر پہلے شام کو رشید کے تین سو سواتی بھی جو چناری سے آئے تھے رخصت ہو لئے تھے۔

میرا مشن پوری طرح ناکام ہو کر ختم ہو گیا تھا۔ چوبیس گھنٹہ کی بے تحاشہ بھاگ دوڑ کا نتیجہ بھی مٹی میں مل چکا تھا۔ مگر میں نے واپس جانے کا نہ سوچا، میں وہ عظیم نام اختیار کر کے اپنی کشتیاں پہلے ہی جلا چکا تھا اور میرا خیال تھا کہ یہ عظیم نام مجھے ولولہ عطا کرے گا اور میری شناخت بھی چھپی رہے گی۔

طارق نے کئی صدیاں پہلے سپین کے ساحل پر اترتے ہوئے اپنی کشتیاں جلا دی تھیں اور جب اسے بتایا گیا تھا کہ واپسی کے واحد ذریعہ کو تباہ کر دینا غیر دانشمندانہ فعل ہے تو اس نے اقبال کے لفظوں میں کہا تھا

ہر ملک، ملک ماست کے ملک خدائے ماست

باب ۹

اڑی

کوئی آدھی رات کا عمل تھا۔ قبائلیوں میں سے آخری لوگ جو بچ رہے تھے، انہیں بھی گئے ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ اوڑی کے چہار جانب اونچی اونچی پہاڑیوں کے درمیان یوں لگ رہا تھا، جیسے ہم کسی بہت بڑے پیالے کی تہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اندھیرا تھا، سردی تھی اور تنہائی تھی۔

کوئی درجن بھر آدمی وہاں رک گئے تھے۔ میجر اسلم اور دو پنشنر، سابق فوجی تھے، انڈین نیشنل آرمی کا ایک سابق صوبیدار تھا۔ ایک سیاسی کارکن لطیف افغانی تھے۔ دو ڈرائیور تھے، ایک باورچی تھا اور دو یا تین سول افراد تھے، جن میں میرا بھائی بھی شامل تھا، ہمارے پاس جو اسلحے تھے، ان میں ایک درجن کے قریب رائفلیں تھیں، اور دشمن سے چھینی ہوئی ایک برین گن تھی میں نے اب تک جتنی فوجوں کی کمان کی تھی، ان میں، سب سے مختصر اور سب سے کم مایہ فوجی طاقت یہی تھی، اس کے باوصف قسمت نے ہمیں ایک ایسا فریضہ سپرد کیا تھا، جس کی ادائیگی سے ہزار آدمی دستکش ہو کر کچھ دیر پہلے رخصت ہو گئے تھے۔

میں نے اندازہ کیا کہ قبائلی اور رضا کار، اس وقت تک سرحد پار کر کے کشمیر سے باہر نکل چکے ہوں گے۔ چونکہ اس علاقہ کے مقامی باشندوں نے ابھی اپنے آپ کو جدوجہد کے لئے متحد نہیں کیا تھا، اس لئے ۷۵ میل لمبی سڑک پر کسی جگہ بھی کسی طرح کی مدافعت کا انتظام نہیں تھا۔ ہندوستانیوں کو اگر یہ حقیقت حال معلوم ہوتی تو وہ اپنے ٹرکوں میں بیٹھ کر چل پڑتے اور تین گھنٹہ کے اندر اندر پاکستان کی سرحد تک جا پہنچتے اور اگر وہ فوراً روانہ نہ ہوتے تو دوسری صبح اپنی پیش قدمی کا آغاز کر سکتے تھے۔ کیونکہ اس وقت تک ان کے طیارے یہ اطلاع دے سکتے تھے کہ کہیں بھی کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہو رہی ہے۔

قبائلیوں کے اس طرح چلے جانے سے ایک خطرناک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ یہ بات کشمیر کے کسی اور علاقہ میں ہوتی تو کچھ زیادہ فرق نہ پڑتا۔ لیکن یہاں تو ایک انتہائی اہم شاہراہ

بھی موجود تھی جو آزاد کشمیر کی جانب نہایت وسیع علاقہ سے گذرتی تھی، اور قبائلیوں کی جگہ لینے والا، دوسرا کوئی قریب میں موجود نہ تھا، قبائلی مارا مار کرتے اور آگے بڑھتے ہوئے اس علاقہ پر قابض ہو گئے تھے اور اب اس کے دفعتاً" ہاتھ سے نکل جانے کا نقصان، اتنا حوصلہ شکن ہوتا کہ دوسرے علاقوں میں آزادی کی تحریک بھی خطرے میں پڑ جاتی۔ یہ ایک ایسا امکان تھا، جس کے تصور سے ہی خوف آتا تھا۔

ظاہر بات ہے کہ اس محاذ کو نئے سرے سے منظم کرنا چاہیے تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ یہ کام کیسے ہو؟ نواحی علاقوں سے اور پاکستان سے لوگوں کو یہاں لایا جا سکتا تھا۔ لیکن ان کے یہاں تک آنے میں کئی دن لگتے اور اس سے پہلے کہ ہندوستانی آگے بڑھ کر اس خلا کو پر کرتے، بس ہمارے لئے چند گھنٹوں کی مہلت باقی رہ گئی تھی۔ اور ہمیں ہندوستانیوں کو آگے بڑھنے سے روکنا تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ ہم لوگ چند پلوں کو تباہ کر دیں۔ اس طرح دشمن کو پیش قدمی میں دیر لگے گی۔ علاوہ ازیں ہم لوگ کچھ اس ڈھب سے کارروائی کریں گے جس سے یہ تاثر پیدا ہو کہ قبائلی ابھی وہاں موجود ہیں۔ اس سے بھی دشمنوں کی رفتار ست پڑ جائے گی۔ اس طرح جو مہلت ملے گی، اس سے ہم مقامی لوگوں سے رابطہ پیدا کریں گے اور رضا کار منظم کرنا شروع کریں گے۔

چنانچہ میں نے اپنے گروپ کے دو حصے کر دیئے۔ ایک پارٹی کو چند میل پیچھے روانہ کیا کہ وہاں مورچہ بنائیں اور ہم میں سے چار آدمی اوڑی میں رہ گئے۔ دشمن ابھی آگے نہیں بڑھا تھا اگرچہ دروازہ اس کے لئے پاٹوں پاٹ چھ گھنٹے سے کھلا ہوا تھا ہم لوگ چپ چاپ انتظار کرتے رہے فی الوقت ہم اس کے سوا کچھ اور کر بھی نہیں سکتے تھے کہ دشمن کا انتظار کریں۔ وقت رینگ رینگ کر گذرتا گیا۔ کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی اور مزید تین گھنٹے گذر گئے۔

پھر یہ ہوا کہ صبح کے چار بجے، ہماری پشت کی جانب دور فاصلے پر کسی گاڑی کی بتیاں روشن نظر آئیں۔ بظاہر کوئی شخص ہماری ہی طرف آ رہا تھا۔ رات بھر جانے والوں کو اپنے سے جدا ہوتے دیکھ کر بسحدم یہ منظر یقیناً دل خوشکن تھا۔ گاڑی ذرا قریب آئی تو معلوم ہوا کہ جیپ ہے، جس میں چار سپاہی (آفریدی) سوار ہیں۔ ایک سپاہی خیال اکبر ہے اور تین دوسرے افراد ہیں۔ وہ کشمیر میں لڑنے کے لئے اپنا یونٹ چھوڑ کر آ گئے ہیں۔ اور مجھے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ سب نہتے ہیں انہوں نے یونٹ چھوڑ آنے کا فیصلہ بالکل ایک

اضطراری کیفیت میں کیا تھا اور اپنے ساتھ اسلحہ لے کر نہیں آئے تھے۔ بہرحال ایک بات ہے کہ چاروں بڑے پختہ اور مضبوط ارادے کے لوگ تھے۔ تمام راستے' انہوں نے دوسروں کو واپس جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور انہوں نے ان چاروں کو مشورہ دیا تھا کہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ اس لئے تم بھی واپس چلے چلو' لیکن انہوں نے دل میں جو ٹھان لی تھی' اس سے انحراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان چاروں نے واپس جانے والوں سے عاریتاً چار بندوقیں مانگی تھیں' لیکن دوسری طرف سے انکار ہو گیا اس کے باوجود وہ آگے بڑھتے گئے۔ اور جب میں نے صورت حالات کی ان سے وضاحت کی اور کہا کہ آپ لوگ چاہیں تو واپس جا سکتے ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم ثابت قدم ہیں' اور آپ کے ساتھ ہی رہنا چاہتے ہیں

گھنٹہ بھر بعد دن نکل آئے گا۔ دشمن کے فوجی دستے اور بمبار جلد ہی اپنے کاروبار سے لگ جائیں گے' لہٰذا انہیں یہ جتانے کے لئے کہ ہمارا مورچہ ابھی وہیں ہے۔ میں نے ان چاروں آدمیوں کو آگے روانہ کیا اور ایک برین گن دے دی کہ ہندوستانی دستے کے سامنے کی صف پر گولی چلائیں' ہندوستانیوں نے اپنی بندوقوں کے دہانے کھول دیئے' لیکن وہ لوگ ادھر ادھر کھیتوں میں بے فائدہ گولی چلا رہے تھے۔ وہاں کون تھا' جسے وہ گولی مارتے ہم لوگ وہاں سے خاصے دور اور خطرے سے باہر تھے۔

چار گھنٹے اور گزر گئے اور ہندوستانیوں نے' جو اس وقت بھی بے حد محتاط تھے۔ پیش قدمی میں کسی طرح کی عجلت ظاہر نہیں کی۔ وہ لوگ دور دور سے گولی چلانے کو ہی کافی سمجھتے تھے۔ اور ہماری طرف سے ہر نصف درجن راؤنڈ کے جواب میں وہ کوئی چھ ہزار راؤنڈ گولی چلا رہے تھے۔ اس میں بھی ہمارا کوئی نقصان نہیں تھا۔ اس طرح ہمیں وقت مل رہا تھا۔ یونہی کئی گھنٹے گزر گئے۔ بمبار طیارے سارے علاقے پر منڈلاتے رہے۔ کہیں وہ بم گراتے تھے۔ کہیں گولیوں کی باڑھ چلاتے تھے اور اس حقیقت کی انہیں کوئی خبر نہیں تھی کہ وہاں ایسی کوئی چیز تھی ہی نہیں جس پر حملہ کیا جاتا۔ چنانچہ اس دوران میں جب کہ ہندوستانی فوج اپنی اس طرح کی کارروائیوں میں مصروف تھی۔ ہمارے تھوڑے سے آدمی اوڑی کے قریب ایک پل تباہ کرنے میں دل و جان سے لگے ہوئے تھے۔ اور بالآخر یہ ہوا کہ سہ پہر ہونے تک ہمیں ایک ٹوٹے ہوئے پل کی پناہ حاصل ہو گئی۔

ہندوستانی جب اس ٹوٹے ہوئے پل کے قریب پہنچے تو ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی اور وہیں' وہ رک گئے۔ اپنے معمول کے طریقے سے انہوں نے جواب بھی دیا لیکن آگے

نہیں بڑھے۔ اب اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت انہیں اندازہ ہوا کہ اندھیرے میں محتاط رہنا پڑے گا۔ رات ڈھلنے تک سارے علاقہ میں ایک بار پھر گھور سناٹا طاری ہو گیا۔ یہ چیز ہمارے موافق تھی' کیونکہ ہم سب ۴۸ گھنٹے سے سو نہیں سکے تھے۔

دوسرے دن' ادھر صبح کا تڑکا ہوا' ادھر ہم نے پھر دشمنوں پر گولی چلائی۔ اور ان کے نشانے کی زد سے دور ہٹ کر بیٹھ گئے۔ اور پھر وہی ہوا کہ وہ لوگ جتنی دیر تک حملہ کرنے سے پہلے اس جگہ دھواں دھار گولہ باری کرتے رہے' اتنی دیر میں ہم لوگ کہیں اور جا پہنچے تھے اس دوران میں کچھ لوگ کسی دوسرے پل کے ساتھ اپنی کارروائی میں مصروف ہوتے' کچھ دوسرے لوگ' لا تعداد نالوں کو بار بار عبور کرتے' ڈھلوان راستوں پر چڑھنے اترنے اور کبھی اس پہاڑی پر اور کبھی اس پہاڑی پر چڑھنے میں مصروف ہوتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ دشمن پر کئی مختلف ٹھکانوں سے گولی چلائیں تاکہ اسے یہ محسوس ہو کہ لوگ اس وقت بھی چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

یہ کارروائی میری توقع کے مطابق کامیابی سے جاری رہی۔ ہم لوگ یہ تاثر پیدا کرنے میں برابر کامیاب ہو رہے تھے کہ جنگ کا محاذ' جہاں پہلے تھے۔ اب بھی وہیں ہے۔ اس تاثر کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی برابر محتاط ہوتے گئے۔ اگرچہ ان کا ہراول پہلے ہی اوڑی پہنچ چکا تھا۔ لیکن اصل فوج کو وہاں پہنچنے میں ایک دن اور لگ گیا۔ اور یہاں سڑک تک آگے آنے سے ہم نے انہیں روکے رکھا تھا۔ سڑک پر آنے کے بعد بھی انہیں معلوم ہوا کہ ایک ایک پل کی مرمت میں بڑا وقت لگ جائے گا۔ اور زبردست تیاری کرنی پڑے گی۔ چنانچہ ہم ایک سے دوسرے پل تک اپنے کام انجام دیتے گئے۔ لیکن اوزار اور ڈائنا مائٹ چونکہ موجود نہ تھا۔ اس لئے پلوں کو تباہ کرنا ایک طویل اور سخت محنت طلب کام تھا۔ اپنی طاقت کا تاثر دینے کے لئے پہاڑیوں پر مسلسل چڑھتے اترتے رہنا بھی سخت تھکا دینے والا کام تھا۔ بہرحال ہمیں مہلت حاصل کرنی تھی۔ اور اس وقت ایک ایک گھنٹہ بڑا اہم تھا۔

پہلے دن کی مہلت جو ہمیں حاصل ہوئی اسے ہم نے محض اپنی خوش قسمتی پر محمول کیا۔ دوسرا دن حاصل کرنے کے لئے ہم نے لڑائی لڑی تھی۔ اور دشمنوں کو کچھ جانی نقصان بھی پہنچایا تھا۔ جب تیسرا دن گزرا تو میں نے سوچا کہ ہم نے تھوڑی بہت کامیابی حاصل کی ہے اس وقت میں نے محسوس کیا کہ ضرور کوئی نہ کوئی ہماری مدد کو آ رہا ہو گا۔ چنانچہ جب رات ہوئی تو بہت سے پر امید چہرے عقب میں دور تک پھیلی ہوئی سڑک کی طرف بے اختیار مڑ گئے۔ لیکن کوئی نہیں آیا۔ چنانچہ ہم اس وقت تک جو کارروائی کر رہے

تھے۔ اسی کو دہرانا پڑا ہر روز ہم ایک پل توڑتے اور ہر روز ہندوستانی وہاں تک کا فاصلہ طے کرتے رہے۔ اس سے آگے جانا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا تھا۔

آخر چھٹے دن ہم لوگوں نے چکوٹی پہنچ کر قیام کیا۔ یہ جگہ اوڑی سے پندرہ میل دور ہے۔ یہاں ہم نے ایک طویل پل کو تباہ کیا تھا۔ جس کے نیچے ایک خاصہ گہرا نالہ بہتا تھا۔ اور نالوں کے دونوں کناروں پر ڈھلوان پہاڑیاں تھیں۔ چنانچہ گاڑیوں کے گزرنے کے لئے اس نالے پر الگ سے کوئی چھوٹا پل تعمیر کرنا غیر ممکن تھا۔ ہندوستانی اگر یہاں سے آگے جانا چاہتے ہیں تو انہیں نئے سرے سے پل بنانا پڑے گا چنانچہ ان کا پہلا گشتی دستہ، جب یہاں پہنچا تو جواب میں ہمارے پاس جو کچھ تھا۔ سب ان کی طرف جھونک دیا۔ ایک ٹرک اور دو لاشیں چھوڑ کر وہ لوگ الٹے پاؤں بھاگ لئے۔ اس کے بعد اور دستے آئے، اور پھر شیل پھینکے گئے گولیوں کی باڑھ چلی اور ہوائی حملے کئے گئے یہاں تک کہ سورج غروب ہونے کو آیا۔ دوسری صبح دشمنوں نے عام لوگوں کے برعکس یہ دیکھا کہ ہماری چوکی جہاں تھی۔ وہیں ہے۔ چنانچہ ان کے پاس متبادل صورت ایک ہی رہ گئی تھی کہ پیدل فوج درختوں سے ڈھکی ہوئی اونچی پہاڑیوں پر جا کر وہاں سے ہمارے دائیں جانب حملہ کرے۔ لیکن حملہ کرنے کے لئے وہ لوگ آگے نہیں بڑھے۔ عین ممکن ہے کہ ہندوستانیوں کا مقصد اوڑی سے اس طرف کو آنے کا نہ رہا ہو۔ ممکن ہے انہیں زیادہ دلچسپی اس بات سے رہی ہو کہ جنوب میں پونچھ کی طرف جائیں جہاں فوجی امداد کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اس کے باوجود ہندوستانی فوجوں کے راستے میں اگر کوئی مزاحمت نہ ہوتی تو یہ بات عین قرین امکان ہے کہ وہ مظفر آباد تک کے اس نہایت اہم علاقہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کا موقع ضرور جھپٹ لیتے۔

چھ دن تک آزادانہ گھومنے پھرنے اور اس کے باوجود نقصان سے بچے رہنے کے بعد مجھے اس بات کا تقریباً پورا یقین ہو چکا تھا کہ کشمیر کے پتھروں اور پشتوں کے درمیان ہمیں گولی نہیں لگ سکتی اور یہ بات درست ثابت ہو چکی تھی۔ مگر دوسرے دن ایک حادثہ ہو گیا۔ سٹیشن ویگن میں، اپنے ساتھ، تین دوسرے آدمیوں کو بٹھا کر لاتے ہوئے، ہم اس علاقہ کی واحد سیدھی سڑک کے ایک میل لمبے ٹکڑے کے درمیان پھنس گئے۔ میں نے دیکھا کہ بمبار سیدھا ہماری طرف آ رہا ہے۔ اس سے پہلے کئی بار ہمیں ٹھہرنے اور پناہ لینے کے لئے خاصہ وقفہ مل چکا تھا۔ لیکن اس وقت تو ہم سب کھلی جگہ پر تھے۔ آگے، پیچھے کسی طرف چھپنے کے لئے کوئی آڑ نہیں تھی۔ یہاں رکنا اور دو سو گز پیچھے قریب ترین چٹان کی آڑ میں پناہ لینے کے لئے بھاگنا ممکن نہ تھا۔ طیارہ، غوطہ لگانے کے لئے اپنی ناک نیچی کرنے

لگا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے دوسری بار غوطہ لگانے کے ساتھ ہی بم گرے گا۔ لیکن ۲۰ ایم ایم کی بندوقوں سے گولیوں کی باڑھ چلنے میں تو چند ہی سیکنڈ رہ گئے تھے۔

ایک لمحہ کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا' جیسے بس آخری وقت آگیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہماری جدوجہد کا کیا یہی صلہ ہے؟ تاہم ایسا بھی نہیں تھا کہ میں انہیں آسانی سے نشانہ بنا لینے کی اجازت دیتا۔ اگر گاڑی انتہائی تیزرفتاری سے دوڑائی جا سکے تو ممکن ہے کہ پائلٹ کا نشانہ بھک جائے اور گولیوں کی باڑھ اوپر سے گزر جائے۔ چنانچہ میں نے اسی بات کی کوشش کی اور اس میں پوری طرح نہیں' لیکن ایک حد تک کامیاب رہا۔ گولیاں گاڑی کی چھت توڑ کر اندر بیٹھے ہوئے ایک شخص کو آکر لگیں اور وہ جاں بحق ہو گیا۔

ہم نے ان سات دنوں میں اس علاقہ کے لوگوں سے رابطہ پیدا کیا تھا' اور انہوں نے ۷۵ رضاکار منظم کر لئے تھے۔ جو اس وقت ہمارے ساتھ شامل ہونے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ آزاد گورنمنٹ بھی اسلحہ اکٹھا کرنے اور رضاکار تیار کرنے میں مصروف تھی اور امداد ہمیں پہنچنے ہی والی تھی۔ باغ اور پونچھ کے نواحی علاقوں سے بھی پیغامات ملے تھے۔ جن میں امداد کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت وہ لوگ اپنے ہی مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔

دو دن بعد' جب کہ ہندوستانیوں سے چکوٹی کو اس وقت بھی خطرہ لاحق تھا۔ کوئی ۳۵۰ پاکستانی رضاکار بالاخر پہنچ ہی گئے۔ ان میں بیشتر سابق فوجی تھے۔ جو رائفلوں سے مسلح تھے۔ اور انہیں دیکھ کر ہی تقویت ہوتی تھی' خطرہ آخرکار ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ لیکن ابھی ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔

ان نوواردوں نے' جن میں بیشتر اگرچہ سابق فوجی تھے' وہاں تک آگے بڑھنے میں' جہاں دشمن کی گولیاں پہنچ سکیں اس قدر پس و پیش سے کام لیا کہ میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس کے بعد کے دنوں میں ایک کے بعد دوسرا کام ان کے سپرد ہوتا رہا اور وہ ہر کام کو چھوڑتے رہے' کیونکہ دشمن کی طرف سے ان پر گولی چلائی جاتی تھی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میجر اسلم کی سربراہی میں وہی مٹھی بھر پرانے آدمی پہاڑیوں میں اکیلے رہ گئے۔ خطرہ کے علاقہ کے باہر دور افتادہ پہاڑیوں پر ان لوگوں سے کام لینے اور دشمنوں کو سرگرمی اور زبردست طاقت کا تاثر دینے سے' ایک خاص حد تک فائدہ ہوا۔ لیکن وہاں بھی یہی ہوتا تھا کہ اگر ایک دو شیل ان کے قریب جا گرتے یا کوئی طیارہ ان کے سر پر منڈلاتا ہوا آ جاتا تو ان میں دہشت کے مارے بھگدڑ مچ جاتی۔

ان میں سے ایک سو آدمیوں کو میں نے دریا کی طرف بھیج دیا' جہاں میرا خیال تھا کہ وہ محفوظ رہیں گے۔ اور جہاں ان کا مقابلہ دشمن کے آخری دستوں سے ہو سکتا تھا اور اس جگہ سے وہ دریا کے دوسری طرف دشمن کی بے پہرہ گاڑیوں پر گولی چلا سکتے تھے جو جگہ میں نے منتخب کی تھی' وہاں وہ لوگ دشمن کی نظروں سے بچ کر بہ حفاظت پہنچ گئے۔ ایک طرف دریا ان کی حفاظت کر رہا تھا' دوسری طرف وہ پہاڑیوں کی آڑ میں تھے۔ لہٰذا وہ لوگ شام ہونے تک وہاں چھپے بیٹھے' دشمن کی سپلائی گاڑیوں کو قطار در قطار' تین سو گز کے فاصلہ سے تنگ سڑک پر گزرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ان گاڑیوں پر کسی طرح کا پہرہ بھی نہیں تھا۔ نہایت شاندار موقع تھا لیکن جواب میں دشمن کی فائرنگ کے ڈر سے انہوں نے یہ موقع استعمال نہیں کیا۔ ایک گولی بھی انہوں نے نہیں چلائی سو میں سے ۹۲ آدمی تو ویسے ہی ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس وقت تک دو سو سواتی واپس آ چکے تھے۔ اور ان پر اگرچہ پوری طرح اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ لیکن باقاعدہ فوجوں کے ساتھ جنگ کے طریقوں سے وہ بھی کافی حد تک مانوس نہیں تھے۔ ایک بار میں نے ان سے یہ کام لیا کہ سڑک اور دوسرے راستوں کی ناکہ بندی کر دیں' جدھر سے بھگوڑے نکل نکل کر جا رہے تھے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھاگنے والوں نے پہاڑیوں کا راستہ اختیار کیا اور اس بھاگم بھاگ میں رائفلیں بھی لے گئے۔ بہرحال رضاکار زیادہ تعداد میں آتے جا رہے تھے۔ ان کی آمد میں چشمے کی روانی کا سا تسلسل تھا لیکن یہاں جو کچھ انہوں نے پایا' وہ بوجوہ انہیں پسند نہ آیا۔ **بعضوں** نے تو ایک ہی نگاہ ڈالی اور واپس ہو لئے۔ **بعضوں** نے تو پہاڑیوں پر ایک بار کی چہل قدمی کو ہی کافی سمجھا۔ بعض افراد نے ایک یا دو راتیں گزاریں' پھر اس کے بعد نظر نہیں آئے۔ اب اس کے لئے میں بھلا کیا کر سکتا تھا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ یہاں آنے سے دوسروں کی حوصلہ شکنی کروں کیونکہ محاذ پر ان کی موجودگی۔ خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو' کچھ نہ کچھ مفید مقصد پورا کر رہی تھی۔ ان کی آمد سے دشمن کو یہ تاثر مل رہا تھا کہ یہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور زبردست سرگرمیاں جاری ہیں یہ بات بڑی حد تک قرین امکان ہے کہ سڑک پر لاریوں میں بھر بھر کر ان کے آنے کی پوری پوری اطلاع دشمن کو اپنے جاسوسوں سے مل رہی تھی' لیکن بھگوڑے چونکہ واپسی کے سفر میں پہاڑیوں سے چھپ چھپ کر جا رہے تھے اس لئے بالعموم وہ نظر نہیں آتے تھے۔ اس طرح دشمن کی نظر میں ہماری تعداد غالباً نہایت تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ چلئے' ان کا ایک فائدہ تو تھا۔ البتہ ہماری طرف انہوں نے جو تاثر چھوڑا وہ کچھ یوں تھا کہ **بعضوں** کی حکمت عملی کی رو سے

مارو اور بھاگو۔ بعض دوسروں کا طریقہ تھا۔ دیکھو اور بھاگو اور **بعضوں** کا طریقہ تھا' بھاگو اور بھاگو۔

سابق فوجی تو کچھ وقت تک میرے لئے محض معمہ بنے رہے۔ ضرورت غالباً یہ تھی کہ ان کے ساتھ اور ڈھب سے کام کیا جاتا۔ ماضی میں انہیں جو تربیت ملی تھی' اس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ سب فوجی' سپلائی' مواصلات اور طبی امداد وغیرہ کے ایک مربوط اور باقاعدہ نظام پر تکیہ کرنے لگے تھے۔ اور یہاں محاذ پر یہ سارے انتظامات مفقود تھے۔ یہاں نہ کوئی تنخواہ تھی اور نہ کسی اور طریقہ کی مجبوری تھی' جو انہیں اپنے فرائض کی انجام دہی کا پابند رکھتی۔ انہیں اپنی کمان میں لے کر چلنے والے افسر نہیں تھے۔ اور سزا یا ڈسپلن کے نفاذ کا کوئی اور طریقہ موجود نہ تھا۔ ان میں سے **بعضوں** نے سیکشن' پلاٹون یا کمپنی کمانڈر کے عہدے اپنے طور پر اختیار کر رکھے تھے۔ لیکن یہ سارا معاملہ سطحی تھا' کیونکہ عملاً کوئی حقیقی اختیار کسی کو حاصل نہ تھا۔ اگر ان کے اپنے مقامی آدمی' جنہوں نے انہیں اکٹھا کیا تھا' خود بھی ساتھ آئے ہوتے تو ان لوگوں کا طرز عمل یقیناً مختلف ہوتا' لیکن ایسا نہ ہو سکا' اس لئے حقیقی خطرہ کی پہلی علامت سے دوچار ہوتے ہی' اگر وہ منتشر ہو گئے تو اس بات پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان میں سے **بعضوں** نے تو یہ دلیل دی کہ ان حالات میں لڑنا صریح خودکشی ہے' اور جو لوگ لڑائی جاری رکھنے پر اصرار کر رہے تھے' وہ ان کی نظر میں بالکل پاگل تھے۔

تاہم اس عرصے میں آنے اور جانے والے ہجوم کے درمیان سے بتدریج ایک نیا عنصر ابھر رہا تھا۔ کہیں کہیں ایک دو افراد اس طرح کے سامنے آ رہے تھے۔ جو اپنی فکر میں سنجیدہ تھے۔ اور جو صورت حال کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اور یہی لوگ رفتہ رفتہ مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر' جنہوں نے شروع سے ہی زبردست احساس ذمہ داری کے شواہد مہیا کئے تھے۔ دفاعی طاقت کا محور بن رہے تھے۔ اس ضلع کے لوگوں کا کوئی فوجی تجربہ نہ تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ہاتھوں میں اسلحہ سنبھال رہے تھے۔ لہٰذا جنگی اہلیت پیدا کرنے کے لئے ابھی انہیں کچھ وقت درکار تھا۔ لیکن یہ معاملہ ان کی اپنی آزادی کا تھا اور اسی لئے نہایت فوری' ہنگامی اور سنگین تھا۔ اس وقت تک وہ اگرچہ کل ۷۵ تھے' لیکن چند ہفتوں کے بعد انہیں لیفٹیننٹ قدرت اللہ (رکن سابق ریاستی فوج) کے ماتحت پہلی مظفر آباد بٹالین کا روپ اختیار کرنا تھا۔

اس وقت تک قبائلی بھی محاذ پر واپسی کے لئے سمجھوتے کی بات چیت شروع کر چکے

تھے۔ جو کچھ پہلے ہو چکا تھا۔ اس کیلئے وہ معذرت خواہ تھے اور چاہتے تھے کہ اس کی تلافی کا ایک موقع دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ موثر کنٹرول کے لئے ان کی بڑی ضرورت تھی، چنانچہ میں نے صرف تین سو محسود قبائلیوں کو آ کر لڑائی میں شامل ہونے کی اجازت دے دی۔ ان کا لیڈر گلاب خاں ایک صاحب کردار اور بہادر آدمی تھا۔ یقیناً وہ اس طرح کا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ جس پر پوری طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

اس رات الاؤ کے گرد بیٹھ کر ہم نے ایک طویل کانفرنس کی۔ محسودوں کے بارے میں مجھے علم تھا کہ ان کو قابو میں رکھنا سب سے زیادہ دشوار ہوتا ہے لیکن سب سے زیادہ جنگ جو بھی وہی تھے اور وہاں ضرورت بھی اسی کی تھی۔ وہ اب تک اس بات پر حیران تھے کہ پاکستان کشمیر میں لڑنے کے لئے کیوں نہیں آتا لیکن باعمل آدمیوں کی طرح دل کی بات کہنے کے بعد وہ اب اپنا فرض ادا کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ تھے۔

دوسرے دن میں نے انہیں پہاڑیوں کی طرف بھیجا۔ ہندوستانیوں کی چوکیوں سے بچتے بچاتے، انہیں چکوٹی اور اوڑی کے درمیان پندرہ میل دور پہنچنا تھا۔ جہاں وہ پہاڑیاں واقع تھیں۔ یہاں سے انہیں اس سڑک تک جانا تھا، جو اوڑی سے جنوب میں پونچھ کی طرف جاتی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اسی سڑک کے ذریعے ہندوستانی فوجیں پونچھ کی طرف کمک روانہ کریں گی، جہاں ان کا ایک گیریزن محاصرہ میں آ گیا ہے۔ یہیں سڑک پر کسی جگہ سے جس کا نقشہ میں تعین نہیں کیا گیا تھا۔ قبائلیوں کو ہندوستانی فوج پر چھاپہ مارنا تھا۔ قبائلی مقررہ جگہ پر پہنچ گئے اور دوسرے ہی دن جب کہ فوجیوں کا ایک قافلہ ادھر سے گزر رہا تھا۔ قبائلیوں نے بڑھ کر چھاپہ مارا۔ ۳۶ لاریاں اس حملہ میں نذر آتش ہو گئیں اور بہت سے ہندوستانی مارے گئے اور قبائلی بھاری مقدار میں اسلحہ، گولہ بارود، فوجی وردیاں اور سامان کے ذخائر، جن میں وائرلیس سیٹ، فیلڈ ٹیلیفون اور تین انچ والے توپ کے نصف درجن گولے شامل تھے۔ اپنے ساتھ لے کر پہاڑیوں پر واپس پہنچ گئے۔

دفعتاً" دیہات میں جوش و خروش کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ "کافروں کو مار بھگاؤ" یہ ایک عام احساس تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہم بھی آگے بڑھنے لگے۔ سامنے کی طرف سے چھپ کر حملہ کرنا اور دائیں بائیں سے بچ کر نکل جانا آگے آنے والے ہندوستانی فوجی دستوں کو زچ کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگنے لگے اور ہم ان کا پیچھا کرنے لگے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ پھر اوڑی کے نواح میں جا پہنچے۔

نومبر کا مہینہ ختم ہونے کو تھا۔ تین ہفتہ قبل یہ محاذ عملاً ٹوٹ چکا تھا اور ہندوستانی فوج

چکوٹی اور پونچھ تک جا پہنچی تھی۔ اب پونچھ سے ان کا رابطہ کٹ چکا تھا۔ چکوٹی سے انہیں پیچھے دھکیلا جا چکا تھا اور اوڑی میں ان کے گرد ایک بار پھر محاذ تیار کر لیا گیا تھا۔

لیکن یہ محاذ در حقیقت کوئی محاذ نہیں تھا۔ ایک آدھ دن بعد چکوٹی سے اوڑی کی طرف سڑک سے جاتے ہوئے مجھے راستے میں ایک فرد بھی نہیں ملا' نہ دشمن نہ دوست کوئی نصف مسافت طے کرنے کے بعد ایک جگہ سڑک سے ایک میل دور پہاڑی کی چوٹی پر ہماری ایک چوکی آتی تھی جہاں کچھ لوگ قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ قبائلی اور مقامی لوگ غالباً یہاں سے کہیں دور ہوں گے۔ تعداد میں یہ لوگ اتنے کم تھے کہ ان پہاڑیوں کی وسعت میں' ان کے آثار بھی نظر نہ آتے تھے۔ اس کے باوجود اس پورے علاقہ پر ہمارا قبضہ اس قدر مکمل تھا کہ ہندوستانی نہ صرف پیچھے ہٹ کر اوڑی میں دبک گئے تھے بلکہ جاتے جاتے اپنے پیچھے پل بھی توڑ گئے تھے۔ پسپا ہونے اور پل کو توڑنے کا عمل' اب یکسر بدل چکا تھا۔ بلوں کے پیچھے چھپنے کی' اب ان کی باری تھی۔ اس رات جب میں پیدل چلتا ہوا چکوٹی واپس ہوا تو میرا ذہن پوری طرح مطمئن تھا۔ اب صرف یہ کام باقی رہ گیا تھا۔ کہ مقامی لوگوں کو مسلح ہونے اور فوجی تربیت حاصل کرنے میں مدد دی جائے۔ اس کام میں چند ہفتے لگیں گے اور اس عرصہ میں قبائلیوں کو وہاں چاروں طرف چوکنا رہنا ہو گا اور جارحانہ کارروائی کرنی پڑے گی۔ تاکہ یہ امکان باقی نہ رہے کہ ہندوستانی ایک بار پھر آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔

اس خیال کے تحت میں نے مزید قبائلیوں کو بلوا بھیجا' ان کے آنے پر میں نے انہیں الگ ذمہ داریاں سونپ دیں۔ میں نے سوچا کہ آفریدیوں کو جن کے لیڈروں میں اتفاق سے میرے دو پرانے ہم جماعت بھی نکل آئے تھے۔ براہ راست کنٹرول کی کم سے کم ضرورت ہے۔ لہذا میں نے انہیں پونچھ روانہ کر دیا۔ تاکہ وہاں محاصرہ میں مدد دیں اور اوڑی پونچھ روڈ کی بھی ناکہ بندی کر دیں۔ مہمندوں کو جو سری نگر سے چوتھے میل کے قریب ایک لڑائی لڑ چکے تھے۔ اپنی صف بندی کے لئے ابھی ذرا کچھ وقت درکار تھا۔ محسود لڑائی کے لئے مستعد تھے۔ لہذا انہی لوگوں کے ساتھ ساتھ میں ایک بار پھر اوڑی کی طرف روانہ ہوا۔ ہماری منزل گوہالاں کا گاؤں تھی جو اڑی کے ایک آدھ میل مغرب میں ہے۔ بڑی سڑک پر سات ہزار فٹ بلند سلسلہ سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے' جس پر دو تین فٹ برف پڑی تھی' ہمیں دو روز لگ گئے' اگلے روز تین طیاروں نے ہم پر حملہ کیا' میں اور بہت سے دوسرے جھونپڑیوں میں پھنس گئے' ہماری چھت زمیں بوس ہو گئی اور دیواریں گولیوں سے چھلنی ہو

گئیں، تاہم کوئی زخمی نہ ہوا، زمین کی ساخت نے ہماری مدد کی ڈھلوانوں پر گرنے والے بم اوپر یا نیچے گرتے تھے جس سے کوئی نقصان نہ ہوا، دو اور حملے ہوئے مگر حیرت کی بات ہے کہ قبائلیوں نے ان کے حملے کو مختلف طریقہ سے لیا، حالانکہ قبل ازیں وہ بھارتی طیاروں کے مسئلہ کو مختلف طرح سے لے چکے تھے، ہرچند کہ ان حملوں میں کوئی ایک شخص بھی زخمی نہ ہوا تھا، دہلی ریڈیو نے اپنی خبروں میں بتایا کہ اس رات ہم میں سے گوہالاں میں تین سو مارے گئے۔ شام کو قبائل آگے بڑھے تاکہ اڑی کے جنوب، مغرب اور شمال کی جانب مورچہ بندی کریں ایک اور جماعت عقب میں سری نگر روڈ کو بند کرنے کی غرض سے روانہ ہوئی میں نے ایک گروپ کو تیاری کی حالت میں رکھا تاکہ ضرورت پڑنے پر کیمپ میں پہنچ سکے، اگلے روز بارہ بجے دوپہر تک حملہ کرتے اور حالات کے مطابق حملوں کا سلسلہ جاری رکھا جاتا، بارہ بجے کیلئے میں نے دشمن پر اچانک حملے کی تیاری کر رکھی تھی، ہم اپنے ساتھ بیس فوجی رضاکار لائے تھے جن کے ساتھ تین انچ دھانہ کی چھ توپیں اور ڈھائی سو گولے تھے، ان سے اس کیمپ میں گولہ باری کی جاتی جہاں دشمن کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس طرح سے بھی قبائلیوں کیلئے ابتدا ہو جاتی، میں نے توپوں کو ایک محفوظ مقام پر رکھا جہاں سے وہ ڈھائی ہزار گز کے فاصلہ پر مار کر سکتی تھیں، میں نے خود کو ایک دوسری جگہ پر تعینات کیا جہاں سے پورا کیمپ نظر آتا تھا، توپوں سے گولہ باری میرے اشارہ پر ہونی تھی۔

صبح کا وقت آہستگی سے گزر گیا، سوائے طیارہ کے جو اوپر اوپر پرواز کرتا رہا، کبھی کبھی کوئی گولہ بھی یہاں وہاں گرتا رہا جس سے کوئی نقصان نہ ہوا، دوپہر کو میں نے سگنل دیا اور سانس روک کر بڑے پیمانہ پر گولہ باری کا انتظار کرنے لگا جو بھارتیوں کیلئے ہماری جانب سے پہلی بار ہوتی، مگر میں بے سود انتظار کرتا رہا اور کچھ بھی نہ ہوا، کئی گھنٹوں کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ توپوں پر تعینات بندوں نے بھی پرانی چال ہی چلی، دشمن کی جانب سے جوابی گولہ باری کے ڈر سے وہ آخر وقت میں وہاں سے چلے گئے تھے اور توپیں پیچھے چھوڑ گئے تھے، قبائلیوں کو بھی توقع تھی کہ بمباری ہو گی مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا، دو روز تک وہ حملے کرتے رہے اور بعض بھارتی گشتی دستے ان کے نشانے کی زد میں آئے مگر کیمپ پر کسی نتیجہ خیز حملہ سے قبل ان کا گولہ بارود ختم ہو گیا۔ گوہالاں میں راشن بھی باقی نہیں رہا تھا اور تیسرے روز جب زبردست برفباری شروع ہوئی تو میں قبائلیوں کو واپس سڑک کی جانب لے آیا، بھارتی کیمپ میں افراتفری اور خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ وائرلیس پر پکڑے جانے والے ایک پیغام کے مطابق بھارتی بریگیڈ کمانڈر نے

سری نگر میں پیغام بھیجا کہ اس کیلئے اپنی جگہ پر برقرار رہنا مشکل ہو گیا ہے اور بظاہر اسے اڑی سے واپسی کی اجازت بھی مل گئی تھی مگر اس وقت تک ہمارے پاس سب کچھ ختم ہو گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم نے ڈھائی سو کو مارا ہے' دشمن نے اعتراف کیا۔ جیسا کہ جنرل میسردی کو کمانڈر انچیف انڈیا نے بتایا کہ ان کے سو آدمی مارے گئے تھے جو اب تک ہونے والا سب سے بڑا نقصان تھا' ہمارے مقابلہ میں وہ مبالغہ آمیز دعوے کرتے اور کہتے کہ سات یا آٹھ سو آدمی مارے گئے ہیں' حقیقت یہ تھی کہ قبائلیوں کے صرف گیارہ آدمی مرے تھے۔ اس طرح گوہالاں کا معاملہ ختم ہو کر رہ گیا' یہ دسمبر کا وسط تھا اور پورے علاقہ میں شدید برف باری شروع ہو گئی تھی مجھے اب یقین تھا کہ سردی کے پورے موسم کے دوران اس محاذ پر سب کچھ ٹھیک رہے گا۔

باب ۱۰

آزاد میداں

اڑی سے مجھے جنرل ہیڈ کوارٹرز آزاد میں بلا لیا گیا۔ وہاں چند روز بعد میں سردار ابراہیم اور ان کی عبوری کابینہ سے ملا۔ میں بھی اب حال ہی میں قائم ہونے والی لبریشن کمیٹی کا ایک رکن تھا' اس مرحلہ پر کمیٹی کو کچھ دور سے صورتحال کا جائزہ لینا تھا' عام پالیسی وضع کرنے کیلئے ابتدائی طور پر کوئی تخمینہ ضروری تھا۔

کشمیر میں شورش اس لئے بڑھی تھی کہ یہ اپنی حفاظت اور جمہوری آزادی کا تقاضا تھا' اس کا کبھی بھی یہ مقصد نہ تھا کہ ریاست کی سالمیت پر حملہ ہو' پھر بھارتی مداخلت تبدیل ہو گئی اور ایک ہی جنبش میں جدوجہد کا سارا کردار بدل گیا۔ یہ ایسے تھا جیسے لوگوں کی ساری امیدوں کے دروازے بند ہو جائیں۔ بھارت نے اپنی فوج کو غیرجانبدار فوج کی حیثیت سے محض قیام امن کیلئے بھیجا ہوتا اور کشمیر کی سیاسی حیثیت کے معاملہ کو سرے سے چھیڑا ہی نہ ہوتا' تو پھر صورتحال دوسری تھی' ایسی صورت میں شاید پاکستان کو بھی بحالی امن کے کام میں ہاتھ بٹانا پڑتا' ریاست کے لوگ بھی احتجاجی مظاہروں کو مزید جاری رکھنے کا کوئی جواز نہ پاتے کیونکہ وہ جان لیتے کہ ایک جانب پاکستان اور بھارت کی فوجیں مل کر مہاراجہ کے ظلم و تشدد سے بچائیں گی اور دوسری جانب اس کی ضمانت ملتی کہ غیرجانبدارانہ طریقہ سے ان کی امنگوں کا اندازہ کیا جائے گا۔

مگر اس طرح سے نہ ہوا' بھارتی اقدام اس طرح ہوا کہ "ہم اپنی قابض فوجوں کو لے آئے ہیں' مہاراجہ تم پر حکومت کرتا رہے گا اور اب ریاست بھارت کی ہے" اس واضح اور صاف مطلب کو اس طرح سامنے لایا گیا کہ جب حالات پرامن اور معمول پر آ جائیں گے تو استصواب رائے ہو گا۔

فوری نتیجہ یہ نکلا کہ احتجاجی مظاہرے تبدیل ہو کر بعض افراد اور علاقوں کی جانب سے' جہاں جہاں ممکن ہوا' ریاست سے علیحدگی کی جدوجہد میں تبدیل ہو گئے اور اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا عمل شروع ہو گیا' شمال میں گلگت' ہنزہ' بنجی اور استور وغیرہ جن کا

مجموعی رقبہ ۱۷۵۰۰ مربع میل کے لگ بھگ ہے' الگ ہو گئے' ۳۱ اکتوبر کو نصف شب کے وقت' الحاق سے چار روز بعد گورنر کی رہائش گاہ کو گلگت سکاؤٹس نے گھیرے میں لے لیا اور اگلے روز وہ گرفتار کیا جا چکا تھا اور عبوری حکومت قائم ہو چکی تھی۔ دوسرے دور دراز علاقوں میں بھی ایسا ہی اثر ہوا' حد یہ ہے کہ بدھ مت کے زیر اثر لداخ میں بھی بے چینی کے آثار پیدا ہوئے اور بلتستان کے دارالحکومت سکردو سے جو اب تک پر سکون چلا آ رہا تھا' باغیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ زوزیلا اور برزل کے پہاڑی دروں کی جانب سری نگر کیلئے خطرہ بن کر بڑھنے لگے۔ مغربی علاقہ باغ میں ریاستی گیریژن کا صفایا کیا جا چکا تھا۔ جنوب میں تحریک آزادی کا مرکز قائم ہو رہا تھا اور وہاں سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ یہ وہ علاقہ تھا جس نے جنگ کے دوران برطانوی فوج میں اسی ہزار کے لگ بھگ افراد فوج میں بھرتی کیلئے بھیجے تھے اور اب یہاں آزادی کی سب سے بڑی قوت ابھر رہی تھی' یہاں بھی بہت سے قبائلی ان سے آن ملے تھے۔ ترم سے طوری دیر سے زاوران کا لشکر حتیٰ کہ افغانستان سے تاجک اور غلزئی بھی یہاں تھے۔ شاید یہ سب سے بڑا اجتماع تھا یہاں دری قبائلیوں نے ایک بھارتی یونٹ کا بے جگری سے مقابلہ کیا تھا اور عملی طور پر اس کا صفایا کر دیا۔

اس طرح علاقہ میں کئی ریاستی چوکیاں صاف کر دی گئیں' چندھر' کوٹلی اور راجوڑی اب آزاد ہاتھوں میں تھیں۔

اسی اثنا میں بھارت سے مزید فوجی دستے کشمیر میں داخل ہوتے رہے۔ سری نگر میں بھارتی فوج ایک بریگیڈ سے ڈویژن تک پہنچ گئی۔ جموں سے ایک اور بریگیڈ نوشہرہ اور میرپور کی سڑک کے ساتھ ساتھ مغرب کی جانب بڑھ رہا تھا' اور یہ ظاہر تھا کہ بھارت اس طاقت میں اضافہ کرتا جائے گا اور اس خطرہ کا بہرطور مقابلہ کرنا ضروری تھا۔ اس لئے ہمارے لئے یہ ضروری تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے آزاد عناصر کی کوششوں کو ہم آہنگ کیا جائے۔ یہ بات نہیں تھی کہ ہم کوئی بھارت کو کشمیر سے نکالنے نکلے تھے۔ ہمیں جو کچھ کرنا تھا' یہ تھا کہ بھارت اس تحریک کو کچل نہ دے اس سمت میں پہلا قدم یہ تھا کہ جدوجہد کو جاری رکھنے کیلئے تین ماہ کیلئے وسائل کا انتظام کیا جاتا' اس وقت تک اس معاملہ کی دنیا بھر میں شنوائی ہو جاتی اور شاید اقوام متحدہ مداخلت کرتی۔

مگر تین ماہ تک جدوجہد کو جاری رکھنے سے گولہ بارود کا سوال پیدا ہو گیا۔ بھارت کے دس ہزار سے زیادہ فوجی پہلے ہی ریاست میں داخل ہو چکے تھے۔ اب توقع کی جا رہی تھی

کہ ان کی تعداد میں بہت جلد تیس یا چالیس ہزار تک اضافہ ہو جائے گا۔ انہیں تحریک آزادی کو کچلنے سے باز رکھنے کیلئے ضروری تھا کہ ہماری طرف دس ہزار مسلح افراد ہوتے۔ لوگوں کی کوئی کمی نہیں تھی مگر رائفلوں کی کمی تھی' اگر ہر شخص ماہانہ گولیوں کے ایک سو راؤنڈ استعمال کرتا تو اس کا مطلب ہوتا کہ ہمارے پاس تین ماہ کیلئے تیس لاکھ راؤنڈ ہوتے مگر اس وقت جو کچھ موجود تھا وہ دس لاکھ کا پانچواں حصہ تھا' اس طرح ہماری سطح پر مستقبل کی منصوبہ بندی کا کوئی سوال نہ تھا۔ ہمیں اپنے آپ کو گھات لگا کر حملے کرنے جیسی کارروائیوں تک ہی محدود رکھنا تھا اور یہ ناگزیر پابندی جدوجہد کے پورے عرصہ پر محیط رکھنا تھی۔

گولہ بارود کے سلسلے میں قبائلیوں کے خلاف شدید الزامات تھے۔ شکایت یہ تھی کہ وہ اپنا بیشتر گولہ بارود کشمیر سے باہر نکال لے گئے ہیں' اس میں صداقت بھی تھی مگر ہمارے پاس اسے روکنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور یہ الزام اتنا برا بھی نہ تھا جتنا بظاہر نظر آتا تھا' قبائلیوں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی ان کا کوئی ذریعہ آمدنی بھی نہ تھا' ان کا یہی روزگار تھا کہ وہ دشمن سے جو کچھ حاصل کریں اسے بیچ ڈالیں' اس طرح سے ملنے والا گولہ بارود بھی وہ فروخت کر دیتے تھے۔ اس کا کچھ نہ کچھ حصہ تو وہ دشمن کے خلاف استعمال کرتے تھے اور اس طرح جو نتائج حاصل ہوتے وہ کافی اطمینان بخش ہوتے' میرا تاثر یہ تھا کہ قبائلیوں اور باقاعدہ فوجیوں کو ایک جیسا گولہ بارود دیا جاتا تو اس میں سے فروخت کرنے کے بعد بھی قبائلیوں کے نتائج بہتر نہ سہی برابر ضرور ہوتے۔ اگر ایک باقاعدہ فوجی ہزار گولیاں استعمال کرتے ہوئے ایک دشمن مارتا تو اسے عموماً ایک اچھی اوسط سمجھا جاتا' یقینی طور پر پچھلی دو عالمی جنگوں میں ایک ہلاکت کی اوسط لاگت ایک نہیں بلکہ کئی سو گولیاں ہوتی تھیں۔ دوسری جانب قبائلی اتنے نزدیک اور اتنی احتیاط سے فائر کرتا کہ عموماً وہ سو گولیوں کے ایک راؤنڈ کے چھوٹے سے حصہ کو استعمال کر کے ایک دشمن مار ڈالتا تھا' باقیماندہ وہ بچا لیتا اس طرح حقیقت میں ہم کچھ بھی نہیں گنوا رہے تھے۔

چند ماہ بعد مجھے اپنے اندازوں کی تصدیق حاصل ہو گئی۔ پانچ سو قبائلیوں اور پانچ سو باقاعدہ فوجیوں نے تین ماہ کے عرصہ میں ایک ہی جتنا گولہ بارود استعمال کیا اور دونوں نے دشمن کا جو نقصان کیا وہ تقریباً ایک جتنا تھا۔

گولہ بارود کے بعد ایک اور اہم حد بھی تھی جسے قبول کرنا تھا' ان کارروائیوں کی نوعیت غیرمنضبط تھی اور یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی مخصوص حکمت عملی وضع کی جاتی۔ کسی خاص

کارروائی کیلئے اسی حساب سے افراد اور وسائل درکار تھے۔ یہ کام اس لئے نہیں ہو سکتا تھا کہ گولہ بارود، خوراک اور اسلحہ کا کوئی مرکزی ریزرو نہ تھا اور نہ ہی اپنے آدمیوں کو ایک سے دوسری جگہ پر تبدیل کیا جا سکتا تھا۔

وہ لوگ اپنی ہی جگہ پر اپنے گھروں کا دفاع کر رہے تھے اور انہیں خوراک بھی مقامی طور پر ہی ملتی تھی۔ اس طرح ہر جگہ پر لوگوں کی تعداد اور مقامی حالات مختلف تھے اور کسی پوزیشن کے کمزور یا کسی کے مضبوط ہونے کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔ حرکت کرنے والا عنصر قبائلیوں پر ہی مشتمل تھا مگر انہیں مختصر مدت کیلئے کام میں لایا جا سکتا تھا۔ کیونکہ جب بھی انہیں کسی مخصوص جگہ پر داخل کیا جاتا تو کچھ ہی دیر کے بعد وہ اپنے آقا خود بن جاتے۔ اکثر اوقات وہ بہت آگے اور بہت دور نکل جاتے جہاں انہیں موزوں ہدف ملتے تھے۔

ہمیں صرف جدوجہد کو جاری رکھنا تھا، جدوجہد کو جاری رکھنے کیلئے بھی زبردست تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے اور تنظیم کا یہ کام لبریشن کمیٹی یا جنرل ہیڈ کوارٹرز آزاد کی ذمہ داری تھی۔

باب ۱۱

سردی کے مہینے

۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو مجھے راولپنڈی میں وزیراعظم کی ایک اور کانفرنس کیلئے بلایا گیا جو سرکٹ ہاؤس میں ہوئی' اب تک کمانڈر انچیف جنرل میسروی کو بظاہر اعتماد میں لیا جا چکا تھا' وہ کانفرنس میں شریک نہ ہوا مگر وہ ایک ملحقہ کمرے میں موجود تھا' جہاں سے اس نے مجھے کرنل اسکندر مرزا کے ذریعے ایک رقعہ بھیجا۔ جب میں باہر نکل کر اس سے ملا تو اس نے ہنستے ہوئے ایک پچھلی ملاقات کا حوالہ دیا جب میں نے اسے کچھ زک پہنچائی تھی۔

یہ ستمبر میں اس وقت کی بات تھی جب کشمیر میں حالات خراب ہو چکے تھے اور جنرل نے جی ایچ کیو کے افسروں کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ہمیں بھارت کے ساتھ چپقلش سے باز رہنے کا انتباہ کیا تھا۔ جنرل نے کہا تھا کہ اس کی رائے میں بھارت جنگ شروع ہونے پر دس دنوں میں پاکستان کا صفایا کر دے گا' میں نے اس کی مخالفت کی تھی اس لئے بھی کہ یہ بات اس وقت کہی گئی تھی جب بھارتی فوج کے دو افسر بھی وہاں موجود تھے' میں نے اسے ایک احتجاجی نوٹ بھیجا تھا اور کہا تھا کہ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے جو اس نے یہ بات بھارتی فوجی افسروں کی موجودگی میں کہی جنہیں اس سے شہہ ملی ہو گی' عددی اور مادی طاقت کے حوالے گمراہ کن ہوتے ہیں کیونکہ جنگ میں فیصلہ کن کردار انہی کی مدد سے ادا نہیں کیا جاتا' لوگوں کا جوش و ولولہ بھی اس میں شامل ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کی نشاندہی کی اگر بھارتیوں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو ہم انہیں مار بھگائیں گے' چاہے ہمارے پاس لاٹھیاں ہی کیوں نہ ہوں۔

میرا نوٹ پڑھ کر اس نے مجھے بلا بھیجا اور کہا کہ شاید اسے پاکستان کے کمانڈر انچیف کا عہدہ قبول نہیں کرنا چاہئے تھا' اور یہ کہ حقیقت میں اس نے انکار کیا تھا مگر بعد ازاں قائداعظم کے اصرار پر چھ ماہ کیلئے اسے قبول کیا تھا' اس نے بھارتی افسروں کی موجودگی میں جو کچھ کہا تھا' وہ اس پر نادم تھا مگر اب بھی وہ یہ سمجھتا تھا کہ لاٹھیوں سے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

اب اس نے میری ستائش کی اور کہا:

"خوب! اب تمہیں لاٹھیوں سے زیادہ دیر کام نہیں چلانا پڑے گا' میں مدد دے رہا ہوں"

اس نے مجھے دس لاکھ گولیوں کے راؤنڈ الاٹ کئے' جس سے ہم مزید ایک مہینہ کام چلا سکتے تھے۔ اس نے مجھے فوج سے تین ہفتوں کیلئے بارہ رضاکار افسر بھی ساتھ لیجانے کی اجازت دی۔ اگلے تین ہفتوں میں' دسمبر کے اختتام تک بھارت نے یہ سوچ کر کہ وہ طاقت کے زور سے تحریک آزادی کو ختم نہیں کر سکتا' معاملہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔

اس نے اقوام متحدہ سے یہ درخواست نہیں کی تھی کہ وہ کشمیری عوام کی امنگوں اور خواہشات کو غیرجانبدارانہ طریقہ سے معلوم کرنے کیلئے مداخلت کرے۔ اس نے اقوام متحدہ سے صرف یہ کہا کہ وہ اس کیلئے وہ کچھ کرے جو وہ خود تنہا نہیں کر سکتا' پہلے وہ پاکستان سے کہہ چکا تھا کہ وہ "چھاپہ ماروں" کی مدد کرنے سے باز رہے' پھر اس نے "چھاپہ ماروں" کو نکال باہر کرنے کی کوشش کی اور اب وہ اقوام متحدہ سے کہہ رہا تھا کہ وہ دونوں کام کر دے۔ بھارت کے ایک سرکاری اخبار کے الفاظ میں بھارت نے فیصلہ کیا کہ "تنازعہ کشمیر کو سلامتی کونسل میں اس جائز امید کے ساتھ پیش کیا جائے کہ اقوام متحدہ عالمی رائے عامہ کا دباؤ پاکستان پر ڈال کر اسے کشمیر میں اپنی جارحیت سے روکے گی۔

(Kashmir Factual Survey - P. 36 (1956))

بھارت کی جس میں زیادہ دلچسپی لگتی تھی وہ یہ تھا کہ پاکستان کو ایک عالمی عدالت سے غیرقانونی مداخلت پر سزا ملے' اس کا مفاد یہ نہیں تھا کہ استصواب رائے کرایا جائے' جواب لازمی طور پر وہی تھا جو برطانوی مندوب نے ۲۷ جنوری ۱۹۴۸ء کو تجاویز پر بحث شروع کرتے ہوئے سلامتی کونسل کے سامنے پیش کیا' اس نے کہا تھا "۔ میرے خیال میں جنگ روکنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ متحارب فریقوں کو یقین دہانی کرائی جائے کہ ان کے حقوق کے مطابق منصفانہ تصفیہ کرایا جائے گا' دوسرے لفظوں میں لڑنے والے تبھی لڑائی روکتے ہیں جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ آگے کیا ہے۔" (S/P.V. 236. 38, 1948 - P. 238)

لہٰذا سلامتی کونسل ہندوستان کی امداد کیلئے نہ پہنچی' اس لئے جدوجہد کو پہلے کی طرح جاری رہنا تھا مگر اب کارروائیوں کیلئے جموں کی مغربی جانب علاقوں کو بنایا گیا' اس جانب انہوں نے طاقت کے ساتھ پیش قدمی کی' آزاد اور قبائلیوں کی جانب سے حد درجہ مداخلت کی گئی' کئی مقامات پر شدید لڑائی ہوئی' ایک بھارتی بریگیڈیئر مارا گیا اور خاصی تعداد میں

فوجی ساز و سامان پر قبضہ کر لیا گیا۔ ان میں کچھ بکتربند گاڑیاں بھی تھیں' تاہم سڑک پر بھارت کا قبضہ رہا اور آہستہ آہستہ سکون کی سی حالت پیدا ہو گئی' کچھ ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ موسم سرما کے مہینوں میں کوئی فیصلہ نہ ہو گا' ہمیں اگلے موسم بہار کیلئے تیاری کرنی ہو گی۔

لبریشن کمیٹی اور جی ایچ کیو آزاد نے وسائل جمع کرنے کی اپنی کوششیں جاری رکھیں اور کئی سیکٹر منظم کئے گئے' آنے والے دنوں میں جو کچھ ہونے والا تھا' اس کا بہت حد تک سہرا کئی آزاد سیکٹروں کے سر بندھتا تھا' تاہم لبریشن کمیٹی اور جی ایچ کیو آزاد کا بھی خاصہ حصہ تھا' کیونکہ سارے انتظامات انہی کے تھے۔ ان دو اداروں کے بغیر پاکستان اور آزاد کشمیر کے لوگوں کی جانب سے امداد مناسب طریقہ سے یکجا نہیں ہو سکتی تھی' لبریشن کمیٹی آہستہ آہستہ اعلیٰ سطح کی سیاسی رابطہ کمیٹی بن رہی تھی اور یہ ایسا کام نہ تھا جس کیلئے اس کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ لبریشن کمیٹی ضابطے' انتظامیہ اور سیاسیات کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ پڑتی گئی' کمیٹی کے صدر جسٹس دین محمد ریٹائرڈ جج تھے' لہٰذا کمیٹی کے اجلاسوں کا رنگ ڈھنگ ایسا تھا جیسے کوئی عدالتی کارروائی ہوتی ہے' عام اطلاعات اور بیانات اکثر اوقات الزامات کی طرح پیش ہوتے اور جرح کی عدم موجودگی میں انہیں قبول کر لیا جاتا' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگی سرگرمیوں کو تیز کرنے کے بجائے لوگ اپنا دفاع کرنے میں لگ گئے' پہل کاری' جدت اور تنوع حوصلہ افزائی کا موجب بننے کے بجائے غیرذمہ دارانہ اقدامات بن گئے۔ کمیٹی کے صدر دیانت دار اور قانونی ضابطوں کا حد درجہ خیال رکھنے والے فرد تھے ان کے بارے میں کمیٹی کے ایک رکن کا یہ کہنا تھا:

"وہ آئینی جج کی طرح ایک ایسے معاملہ کا تصفیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو حد درجہ بے قاعدہ معاملہ ہے۔"

جنگی کارروائیوں کی ذمہ داریوں کا بوجھ جی ایچ کیو آزاد پر براہ راست پڑ گیا' مگر وہاں ناکافی عملہ تھا' ریکارڈ اور مواصلات کے انتظامات بھی اطمینان بخش نہ تھے' اس ادارہ کی کوششیں ہرچند کہ مخلصانہ ہوتی تھیں' مگر ہر مرتبہ بار آور نہیں ہوتی تھیں' جی ایچ کیو آزاد کے اوپر وزیر دفاع تھا۔ یہ ریاست کی فوج کا ایک نہایت قابل عزت ریٹائرڈ افسر تھا' جو وہاں ہونے والے افراتفری جیسے انتظامات پر مطمئن نہ تھا' اس کے پاس برٹش فیلڈ سروس ریگولیشن کی ایک کاپی تھی جس پر اس نے جابجا نشانات لگائے ہوئے تھے' وہ چاہتے تھے کہ ہیڈ کوارٹرز کو جنرل وغیرہ کی طرح الگ الگ شاخوں میں منظم کیوں نہیں کیا گیا' یہاں پر چند

افراد کو جن میں سے کوئی بھی میجر کے عہدہ سے اوپر کا افسر نہ تھا' جمع کر لیئے گئے تھے۔ جنگ کے دوران ان کا کام ویلفیئر افسروں کا تھا' جی ایچ کیو آزاد سے نیچے کمانڈروں اور لیڈروں کا ایک اژدھام تھا' یہ سارے رضاکار تھے۔ پونچھ کے قریب دو متحارب کمانڈروں نے ہیڈ کوارٹرز بنائے ہوئے تھے' یہ دونوں جی ایچ کیو آزاد کو اپنی رپورٹیں بھیجا کرتے' ایک اپنے دستخط کرتے ہوئے خود کو میجر لکھتا اور دوسرا کیپٹن' پھر ان کی میجر اور کرنل کے عہدوں پر ترقی ہو گئی' پھر وہ کرنل اور بریگیڈیئر بن گئے اور اسی طرح ترقی کرتے گئے۔ حتیٰ کہ دونوں فیلڈ مارشل بن گئے' شاید یہی وجہ تھی کہ وزیر دفاع نے یہ دیکھ کر کہ اب کوئی عہدہ باقی نہیں رہا' جرمن عہدہ' کیپٹن جنرل لے لیا۔

اس طرح بالائی سطح پر کیپٹن جنرل اور نیچے چند فیلڈ مارشلوں میں پھنسا جی ایچ کیو آزاد کافی مہارت کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھے ہوئے تھا اور اس نے نہ صرف اپنا کام بڑے اچھے طریقہ سے جاری رکھا' بلکہ جنگ جیتنے کیلئے مختلف تدابیر پر غور و خوض کیلئے وقت بھی نکال لیا' اس سلسلہ میں تجاویز مسلسل آتی رہتی تھیں۔ ان میں سے خصوصاً ایک ہوائی حملے کا منصوبہ خاصی دلچسپی کا باعث بنا' کافی سے زیادہ ابتدائی خط و کتابت کے بعد' انتہائی خفیہ منصوبہ ایئرفورس کے ایک سابق وارنٹ آفیسر نے ٹائپ کیے ہوئے صفحات اور بلیو پرنٹس کے ساتھ بھیجا' بعد ازاں معلوم ہوا کہ اس کا تعلق کشمیر سے نہیں بلکہ یہ پورے بھارت کی فضائی تسخیر کا منصوبہ تھا' جو گلائیڈروں کے ذریعے کیا جانا تھا' یہ ایک قابل عمل منصوبہ تھا' مگر اس پر عملدرآمد کیلئے پہلے دو ہزار گلائیڈر درکار تھے!

ایک اور منصوبہ بھارت سے آنے والے ایک مہاجر نے پیش کیا' اسے یقین تھا کہ وہ دور تک مار کرنے والے راکٹوں کی تیاری کے کام سے واقف ہے' اس کا کہنا تھا کہ اس نے جرمن منصوبوں کا مطالعہ کر رکھا ہے اور اس میں اضافہ کر کے اس نے اپنی ایجادات بھی کی ہیں۔ اب اسے محض اس قدر درکار تھا کہ اسے ایک ورکشاپ کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں' جس کے بعد وہ مظاہرہ کر کے بتائے گا کہ وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔ پاگل قرار دے کر اس سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا' بالآخر اسے مطلوبہ سہولتیں بہم پہنچائی گئیں اور اس نے کام شروع کر دیا' مگر چھ ہفتوں کے بعد اس نے گولی کی شکل کا بیس فٹ لمبا لکڑی کا ٹھوس ٹکڑا پیش کیا جس پر سبز رنگ کیا ہوا تھا' ایک جانب چاند اور ستارہ تھا۔

یہ وہ دن تھے جب پونچھ کے اردگرد سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں' شہر کے اندر بھارتی فوج کی کمان بریگیڈیئر پریتم سنگھ کے پاس تھی۔ اس کی فوج اور شہریوں کا انحصار باہر سے

پہنچنے والی رسد پر تھا' اڑی پونچھ روڈ نومبر سے بند تھی' دوسرا واحد راستہ گلمرگ کی پہاڑیوں سے ہو کر آتا تھا' مگر بھاری برف باری کے باعث یہ راستہ بھی بند تھا' اس راستے کے ذریعے سے کتنی رسد پہنچ چکی تھی' مجھے اس کا علم نہیں' تاہم اتنا ضرور پتہ تھا کہ یہ رسد بہت کم تھی' تمام زمینی راستے بند ہو جانے کے بعد اب بھارتیوں کا انحصار فضائی راستوں پر تھا' جو چند ڈکوٹا طیارے اترے تھے ان کے ذریعے کتنی اشیائے ضروریہ لائی گئی ہوں گی' مگر اب جبکہ ہم نے رن وے پر گولہ باری کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا۔ ضروری اشیاء لانے کا یہ انتظام بھی ختم ہو چکا تھا اور چند ہی دنوں کے اندر پونچھ میں حالات تشویش ناک ہو گئے' تب ہی ایک غیر معمولی بات ہوئی' سیکٹر کمانڈر' کرنل صادق خاں کو احکامات ملے کہ ہمیں پونچھ کے خلاف عارضی طور پر فائربندی کرنی ہے' بظاہر ایسا زخمیوں اور بیماروں کے انخلا کے لئے کرنا مطلوب تھا مگر ہمارے لوگوں کے سامنے بھارتیوں نے اس موقع کو اپنی طاقت مجتمع کرنے کی غرض سے استعمال کیا اور ساتھ ہی اردگرد کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا تاکہ مستقبل میں ایئر لینڈنگ کو محفوظ بنایا جا سکے۔

سردی کے دن پرامن طریقے سے گزر گئے تاہم ہر جگہ حالات ایک جیسے نہ تھے' ہماری اپنی جانب کرپشن بڑھ رہی تھی' راولپنڈی سے بھیجے جانے والا راشن اور سٹورز محاذ پر اکثر اوقات سرے سے ہی نہیں پہنچتا تھا' پارچات' کمبل اور دوسری اشیاء جو پورے پاکستان میں لوگوں کی جانب سے فراخدلانہ دی جا رہی تھیں۔ پنڈی کے بازاروں میں کھلم کھلا فروخت ہو رہی تھیں۔ سرکاری حکام اور لیڈر جو مشکل سے رضامند کر کے انتظامی معاملات کیلئے آزاد علاقہ میں لائے جاتے وہ لکڑی کے سودے کرنے میں لگے رہتے یا ایسے ہی منافع بخش کام ڈھونڈتے رہتے۔ میرے سینئر بھی بیکار نہیں بیٹھے تھے' پہلے تو انہوں نے وہ امداد روک لی' جس کی ظاہر ہے ان پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی' پھر ان افسروں کی مخالفت جاری تھی۔ جنہوں نے رضاکارانہ خدمات پیش کی تھیں' اس کے بعد میرے خلاف باقاعدہ مہم شروع ہو گئی' جس کا مجھے پتہ نہ چلا کیونکہ میرا سارا وقت اور ساری توجہ محاذ کے کاموں پر صرف ہو رہی تھی۔

اس وقت مجھے خاصی تکلیف ہوئی جب ایک روز مجھے تین ماہ کی کمان تنخواہ سے محروم کر دیا گیا۔ وجہ یہ بتائی گئی "۔ میں ڈیوٹی سے غیر حاضر تھا" میں نے یہ سوچ کر کچھ نہ کیا کہ یہ معمولی معاملہ ہے جو بعد میں طے ہو جائے گا۔ مگر سارا کچھ یہی نہیں تھا' راولپنڈی کے میرے اگلے دورے پر مجھے معلوم ہوا کہ سلیکشن بورڈ نے جو ہمارے جرنیلوں پر مشتمل تھا'

یہ فیصلہ کیا کہ میرے دو جونیئروں کو مجھ پر ترقی دے دی جائے' یہ اس قدر نامناسب حرکت تھی کہ میرے احتجاج کے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اس فیصلہ کو منسوخ کرنا پڑا' مگر معاملہ یہاں بھی ختم نہ ہوا اس وقت مجھے سازش کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا اور نہ ہی یہ پتہ تھا کہ چند ہی ہفتوں کے اندر میرے خلاف کسی درجہ مخالفت پیدا ہو چکی ہے۔

تاہم' میں نے یہ محسوس کیا کہ محاذ پر مجھے ویسا تعاون حاصل نہیں ہو رہا جو ضروری تھا' لاہور میں وزیراعظم کے ساتھ ہونے والی کانفرنس میں میرے ذمہ یہ کام لگایا گیا تھا کہ میں تین ماہ تک جدوجہد کو آگے بڑھاؤں اور اب جبکہ یہ تین مہینے گزر چکے تھے' میں محسوس کر رہا تھا کہ اب فوج میں واپس جانے کا مناسب وقت آگیا ہے۔

محاذ پر کہیں بھی خطرے کی کوئی بات نہ تھی' اوڑی سیکٹر میں بھاری برف باری ہو چکی تھی' دوسری تمام جگہوں پر بھی صورتحال جوں کی توں تھی' کشمیر پر ہمارے دعویٰ کی دنیا بھر میں حمایت ہو رہی تھی اور لگتا تھا کہ فیصلہ اقوام متحدہ نے کرنا ہے۔ فروری ۱۹۴۸ء کے وسط میں میں نے کہا کہ مجھے فارغ کر دیا جائے' کچھ روز بعد ایک اور کانفرنس میں وزیراعظم اس پر رضامند ہو گئے' اسی دوران میں لبریشن کمیٹی میں میرے فرائض بریگیڈیئر شیر خان سنبھال رہے تھے۔

باب ۱۲

گرمیوں میں بھارتی حملہ

وسط اپریل ۱۹۴۸ء کے لگ بھگ مزید بھارتی فوج کشمیر میں پہنچنا شروع ہو گئی۔ گذشتہ دو ہفتے سے ہمارے مخبروں کی فراہم کردہ خبروں اور بھارتی فوجوں اور ان کی کمانڈ کے مابین ہونے والی گفتگو اور بھارتی حکومت کے پراپیگنڈے سے اب یہ بات یقینی ہوتی جا رہی تھی کہ بھارت بہت جلد کشمیر میں کچھ کرنے والا ہے یا کشمیر میں کوئی بہت بڑا واقعہ رونما ہونے والا ہے۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے بھارت اور پاکستان دونوں کو اس امر کی تاکید کی کہ کوئی بھی فریق کشمیر میں صورتحال کو مزید خراب کرنے سے گریز کرے' کیونکہ اب یہ مسئلہ اقوام متحدہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی اسے حل کرے گی۔ پہلے بھارتی رہنماؤں کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ بھارت کشمیر میں صرف بغاوت کو فرو کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے اس کے بعد وہ کشمیر میں غیر جانب دارانہ رائے شماری کروائے گا' خواہ اس کے نتیجے میں کشمیری عوام پاکستان سے الحاق کا فیصلہ ہی کیوں نہ کریں مگر اب بھارت اپنی جارحیت کو چھپانے کے لئے کسی بہانہ بازی کو بھی غیر ضروری سمجھتے ہوئے صرف اسی بات پر اڑا ہوا تھا کہ کشمیر ہر صورت میں بھارت کے پاس رہنا چاہئے کہ یہ بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔

تھوڑے دنوں بعد ہی پنڈت جواہر لال نہرو نے آئین ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے اپنے ان خیالات کا اظہار بڑے واضح لفظوں میں یوں کیا' "ہمیں اس امر سے گہری دلچسپی ہے کہ کشمیر کے الحاق کا فیصلہ کس کے حق میں ہوتا ہے مگر ہم اس بات کو کسی صورت فراموش نہیں کر سکتے کہ ریاست کشمیر کا محل وقوع بھارت کی سلامتی کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس کو سرحدیں پاکستان' افغانستان' سوویت یونین اور چین سے ملتی ہیں۔"

مسٹر گوپال کے الفاظ میں اس کی مزید وضاحت نظر آتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ چالیس لاکھ کشمیریوں کا مفاد نہیں بلکہ بھارت کا اپنا خواب اسے کشمیر میں دھکیل رہا تھا جو

اس نے وسطی ایشیا کے نقشہ میں اپنے وجود کے سلسلہ میں بنایا تھا' گوپال کا کہنا ہے: وسطی ایشیا کے نقشہ میں کشمیر کے بغیر بھارت اپنا کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکتا' فوجی اعتبار سے بھارت کے تحفظ کیلئے کشمیر ضروری ہے' تاریخ کا سفر شروع ہونے سے اب تک ایسا ہی ہے اس کے شمالی حصے ہمیں پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبہ اور شمالی پنجاب تک رسائی دیتے ہیں' شمال میں سوویت روس کی وسطی ایشیائی جمہوریاؤں تک یہی راستہ ہے۔ مشرق میں چین اور مغرب میں افغانستان ہیں۔

(کاروان' نئی دہلی فروری ۱۹۵۰ء صفحہ ۶۷)

یہ تھے وہ خیالات جن کے ساتھ بھارت نے یہاں حملہ کی تیاریاں کیں اور صورتحال اس درجہ خطرناک ہو رہی تھی کہ اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بیس اپریل ۱۹۴۷ء کو پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی نے حکومت پاکستان کو ایک یادداشت پیش کی جس کا خلاصہ یہ ہے۔ "اگر بھارتی فوجوں نے مظفر آباد کے علاقے کو فتح کر لیا تو کشمیر میں لڑنے والے قبائلی رضاکار نہ صرف مشتعل ہو جائیں گے بلکہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ اپنی بندوقوں کا رخ پاکستان کی طرف پھیر دیں کیونکہ حکومت پاکستان نے انہیں اس جنگ میں کوئی براہ راست مدد فراہم نہیں کی۔ اگر پاکستان یہ نہیں چاہتا کہ مزید پچیس لاکھ بے گھر مہاجرین پاکستان کے لئے درد سر بنیں۔ اور اگر پاکستان یہ چاہتا ہے کہ بھارت پاکستان کو پشت اور اردگرد سے گھیرتے ہوئے اس کے دروازے پر نہ آ بیٹھے' اور اگر پاکستان چاہتا ہے کہ اس کی شہری آبادی اور فوج کے حوصلے اس حد تک پست نہ ہو جائیں اور ملک میں پاکستان دشمن قوتوں کو کھلم کھلا ملک دشمن کارروائیوں سے روکنا چاہتا ہے تو پاکستان کو ابھی ایسی کارروائی عمل میں لانی چاہئے کہ بھارتی فوجوں کی پیش قدمی کو اس لائن سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ چواری' پونچھ اور نوشہرہ تک واقع ہے۔

(سلامتی کونسل ۸ فروری ۱۹۵۰ء)

چند ہی دن بعد حکومت پاکستان نے کشمیر میں اپنی کچھ فوجی نفری بھیجنے کا فیصلہ کیا' مگر اس فیصلے کا پس منظر یا مقصد صرف پاکستان کے اپنے دفاع کو سامنے رکھتے ہوئے کیا گیا اور یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ پاکستانی فوج کشمیر کے محاذ پر قبائلی رضاکاروں کی پشت پر رہے گی اور بھارتی فوج سے براہ راست ٹکراؤ سے حتی المقدور گریز کیا جائے گا' اور یہ بھی کہ یہ فوج براہ راست جی۔ ایچ۔ کیو راولپنڈی کی کمان میں ہو گی یہ کارروائی اس حفاظتی اور دفاعی نقطۂ نظر سے کی گئی تھی کہ بھارتی فوجوں کو مظفر آباد کی طرف پیش قدمی سے روکا جائے۔

میں ان دنوں تعطیلات پر تھا جب میں واپس آیا اور پاکستانی فوج کشمیر کی طرف روانہ ہوئی تو مجھے ایک انتہائی محدود سیکٹر کی کمان سونپی گئی۔

اپریل کے آخری دنوں میں میں اپنے بریگیڈ کے ساتھ سرحد میں واقعہ کوہاٹ کی چھاؤنی میں موجود تھا' جہاں دس مئی کو ہمارے بریگیڈ کو راولپنڈی پہنچنے کا حکم موصول ہوا۔ راولپنڈی پہنچنے پر ڈویژنل کمانڈر نے بریگیڈ کے کچھ حصہ کو محاذ کے اس مقام کی طرف روانہ کر دیا جو پہلے منتخب کیا جا چکا تھا۔

اس دوران بھارتی فوجیں سرینگر میں جمع ہو رہی تھیں وہ سرینگر سے بارہ مولا اور اڑی روڈ پر نقل و حرکت میں مصروف تھیں جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ دشمن بارہ مولا اور اڑی کے راستے مظفر آباد کی جانب پیش قدمی کا ارادہ رکھتا ہے اور یہی وہ سیکٹر تھا جہاں مجھے متعین کیا گیا تھا۔

گیارہ مئی کو اڑی کے مقابل شاہراہ پر جو فوجی نفری موجود تھی' ان میں ایک باقاعدہ بٹالین' کچھ سرحدی سکاؤٹ' کچھ قبائلی رضاکار اور کچھ آزاد حکومت کے یونٹ تھے۔ اس کے علاوہ:-

1) 3F. F. / 1 رائفل جس کی کمان لیفٹیننٹ کرنل بشیر احمد کر رہے تھے۔
2) 15 / 1 پنجاب رجمنٹ
3) 10 / 4 بلوچ رجمنٹ
4) 12 F.F. / 5 رجمنٹ (گائیڈز)
5) قرم ملیشیا
6) کلا فورس جس کی کمان کالا خان کے ہاتھ میں تھی۔
7) 1 / 2 پنجاب رجمنٹ جس کی کمان لیفٹیننٹ کرنل آدم خان کے سپرد تھی۔

سکاؤٹوں کی تعداد سو سے بھی کم تھی قبائلی رضاکاروں کی تعداد کا اندازہ حسب معمول ممکن نہ تھا جبکہ آزاد سویلین یونٹ حقیقی معنوں میں تاحال ایسی جنگ کے لئے موزوں نہ تھے۔ موخر الذکر آزاد یونٹ بلاشبہ دو بٹالین پر مشتمل تھے مگر اول تو ان کی طرح تربیت نہیں ہوئی تھی' دوم ابھی تک ان کی تنظیم انتہائی ڈھیلی ڈھالی تھی' سوئم انہیں کسی قسم کی تنخواہ نہیں ملتی تھی اور چہارم انہیں نہ تو وردیاں ملتی تھیں اور نہ ہی باقاعدہ راشن' ایلی خوراک ملتی تھی ان میں سے بیشتر لوگ وہ تھے جنہیں پہلے کبھی کبھار ماضی میں محدود فوجی خدمات کا تجربہ رہا ہو گا اور ان کے پاس رائفلوں کے سوا کسی قسم کا اسلحہ نہ تھا۔

مزید شمال میں ٹیٹوال سے آگے کرشن نگر کی وادی باوجود اس کے اسے پہاڑی سلسلے نے بالکل الگ کر رکھا تھا۔ اسی سیکٹر کا حصہ تھی اور وہاں بھی ایک باقاعدہ رائفل کمپنی کے علاوہ کچھ آزاد شامل تھے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ محاذ جنگ پر دشمن کے مقابلے میں اس سیکٹر پر باقاعدہ فوج کی صرف ایک بٹالین اور ایک کمپنی ہی تھی' میں نے مزید تین کمپنیوں کو تین مختلف مقامات پر متعین کیا ہوا تھا' جن میں سے ایک کمپنی مظفر آباد دوسری کوہالہ اور تیسری کو باغ کے لئے مختص کر دیا تھا۔ یہ تینوں کمپنیاں صرف شہری دفاع کی غرض سے رکھی گئی تھیں اور انہیں سختی سے حکم دیا گیا تھا کہ یہ کسی بھی صورت میں آگے نہ بڑھیں۔ بریگیڈ کی تیسری بٹالین میں سے ایک کمپنی کو مری میں رکھا گیا تھا اور بقایا کو پونچھ کے باہر متعین کیا گیا اور یہ لوگ میری کمان سے باہر تھے۔ مجھے یہ بھی حکم دیا گیا کہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے علاوہ میں خود بھی مری میں قیام کروں۔

ان دستوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ دشمن کی جانب سے کسی بھی حملے کی صورت میں اس علاقے کا دفاع کریں۔ یہ ایک عمومی قسم کا حکم تھا اس میں ایسی کوئی خصوصی بات نہ تھی جس کے تحت کسی مخصوص مقام کے دفاع یا تحفظ کو ہر قیمت پر کرنا ہو بلکہ مقصد صرف یہ تھا کہ دشمن کسی بھی جانب یا کسی بھی مقام سے حملہ کرے تو اسے روکا جائے۔

میرے خیال میں اگر دشمن آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو اسے روکنے کے لئے ہمارے پاس کافی تعداد میں نفری نہ تھی' لہٰذا اس کا علاج میں نے یہ سوچا کہ دشمن کی قوت کمزور کرنے کے لئے اسے انتشار کا نشانہ بنایا جائے۔ اس مقصد کے لئے ایک معقول تعداد کو پہاڑیوں پر بھیج کر دشمن کے دونوں بازوؤں پر اس طرح فائرنگ کی جائے کہ دشمن اپنے آپ کو پہاڑیوں کی جانب سے محفوظ رکھے۔ غرض کچھ طاقت کو اس طرف لگا دے۔ اس مقصد کے لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم جن جوانوں کو پہاڑیوں پر بھیجیں ان کے لئے خوراک اور رسد کی باقاعدگی سے فراہمی جاری رہے اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب کوہالہ باغ روڈ ہماری دائیں جانب ہو۔

اس تجویز کو قبول کر لیا گیا اور ہمارے راستہ بنانے والے سپاہیوں نے اس پر کام بھی شروع کر دیا۔ یہاں خچروں کے ساتھ سفر کے لئے راستہ پہلے ہی سے موجود تھا مگر اب اسے ٹرکوں کی نقل و حرکت کے قابل بنانا تھا۔ اس سڑک کی یہ لمبائی پچاس میل کے قریب تھی۔ اس علاقے کے مقامی لوگوں کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا' انہوں نے تقریباً

ایک ہزار افراد روزانہ کے حساب سے مزدور فراہم کر دیئے جو بغیر اجرت کے کام کرنے پر رضامند تھے۔ تاہم اس سڑک کی تکمیل کے لئے کافی وقت درکار تھا۔

پندرہ مئی اور اس علاقے میں میری آمد کے چار روز بعد یعنی بھارتی حملہ سے محض تین روز قبل مجھے یہ حکم ملا کہ اڑی کے علاقے میں اپنی بٹالین کی کمان کسی اور کے سپرد کر کے خود بذریعہ ٹیٹوال اپنی شمالی پارٹی یا نفری سے جا ملوں اور وہاں سے سرینگر کی جانب پیش قدمی کروں اور یہ کہ پانچ ہزار قبائلیوں کو اپنے ساتھ یا پیچھے لے چلوں۔ بلاشبہ یہ تجویز انتہائی قابل قدر تھی، اس طرح ہم سرینگر اور اڑی کے درمیان دشمن کو نہ صرف دائیں بائیں بازو سے پریشان کرتے بلکہ مظفر آباد کی طرف بڑھنے والی فوج کو اس کی بے خبری میں پیچھے سے جا لیتے اور اس کے ساتھ ہی سرینگر پر بھی اثر انداز ہو سکتے، مگر اب اس تجویز پر عمل درآمد کا وقت گزر چکا تھا نیز یہ کہ پانچ ہزار قبائلی میں کہاں سے اکٹھے کروں گا۔ میرے خیال میں اس طرح میں نہ صرف حقیقی مقصد سے ہٹ جاتا بلکہ دشمن کے اتنے طویل انتظار میں وقت ضائع کر دیتا۔

پانچ ہزار قبائلیوں کو مجتمع کرنے کے لئے کم ازکم دو ہفتے کی مدت درکار تھی اور مظفر آباد سے ٹیٹوال تک کا فاصلہ تقریباً ساٹھ میل تھا جو جنگلات اور پہاڑی علاقہ ہونے کے باعث بہت کٹھن اور دشوار گزار تھا جس کے لئے کم ازکم چار دن درکار ہوتے، اس کے علاوہ پانچ سو قبائلیوں اور اپنی نفری کے لئے خوراک، طبی امداد کا سامان اور دیگر ضروریات کے نقل و حمل کے لئے کم ازکم ہر مرحلے پر چار سو آدمیوں کی ضرورت تھی، اس لئے مجھے یہ سب کچھ ناقابل عمل نظر آ رہا تھا، لہٰذا انیس اکتوبر کو میں نے ہیڈ کوارٹر کو ایک تفصیلی رپورٹ بھیجی، جس میں ان مشکلات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان تمام حقائق کے باوجود اگر حکم پر نظر ثانی نہ کی گئی تو میں اکیلا روانہ ہو جاؤں گا، جبکہ دشمن اری سے آگے بڑھنے کے لئے تیار ہے۔

ابھی اس رپورٹ پر دستخط کئے ایک گھنٹہ ہی گزرا ہو گا کہ یہ خبر پہنچی، دشمن گذشتہ رات ہی کو پیش قدمی کر چکا ہے اور پھر پورا دن ادھر ادھر سے دشمن کی پیش قدمی اور حملے کی خبریں پہنچتی رہیں۔ ہمیں تین جانب سے دشمن کے حملے کا مقابلہ تھا یعنی جہلم کے دونوں طرف سے اوری اور ٹیٹوال۔ حالات سے یہ پتہ چل رہا تھا کہ ہمارے آگے والے دستے پسپا ہونے پر مجبور ہیں، مگر ان کی اس پسپائی میں بھی بڑا نظم و ضبط تھا اور وہ ہر مورچہ چھوڑنے سے قبل پیچھے دوسرے مورچے کو بہتر انداز میں سنبھال لیتے اور اس طرح دشمن کو بڑھنے

میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے دستوں نے بعض دیگر مقامات پر دشمن کو بھاری جانی نقصان پہنچایا ہے جب کہ بعض دیگر جگہوں پر صورتحال مبہم تھی۔

جہاں تک شمال میں ٹیٹوال سے آگے ہمارے دستے کی صورتحال کا تعلق تھا ہمیں واضح طور پر نظر آ رہا تھا کہ وہ کسی مشکل سے دوچار ہیں، مگر موجودہ صورتحال میں اگر ہم کچھ کرنا بھی چاہتے تو یہ ممکن نہ تھا' لہٰذا ہم نے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

اوڑی کے مقام پر مظفر آباد کی طرف آنے والی یہ شاہراہ ہی دراصل اصل محاذ جنگ تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس پر دشمن کو ہماری کسی کمزوری کا تاثر ملے' تاہم میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ اگر اوڑی سے میری یہ بٹالین کچھ فاصلے پر پیچھے ہٹی تو ہم دوسرا مورچہ چکوٹی پر بنائیں گے' چونکہ وہ جگہ ہمارے لئے اور بھی زیادہ مفید اور محفوظ ہو گی اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اوڑی سے بغیر کسی مزاحمت کے ہی پیچھے ہٹنا چاہتے تھے' مشکل یہ تھی کہ دریا کی دونوں جانب ہمارے جو گروہ کام کر رہے تھے' ان کی دفاعی حیثیت بہتر نہیں تھی' لہٰذا میں نے مری میں موجودہ کمپنی کو بلایا تاکہ وہ دشمن کے دونوں بازوؤں اردگرد سے حملہ کر کے دشمن کی توجہ ہٹائے رکھے تاکہ اصل شاہراہ پر ہماری دفاعی حیثیت زیادہ متاثر نہ ہو۔

بیس تاریخ کو صبح پانچ بجے جو خبر ملی وہ حوصلہ افزا نہ تھی' اطلاع یہ تھی کہ ہمیں ہر محاذ پر پیچھے دھکیلا جا رہا ہے۔

دوپہر کو اپنے بٹالین کمانڈر کی جانب سے جو پیغام ملا' وہ نہ صرف چونکا دینے والا تھا بلکہ مزید پریشان کن تھا۔ جس میں اس نے بتایا تھا کہ دشمن کی فوجیں اوڑی اور چکوٹی کے درمیان پہنچ گئی ہیں اور یہ کہ آزاد یونٹ صدمے' دہشت اور خوف سے تتر بتر ہو گئے ہیں۔ محدود تعداد اور صرف بٹالین سے تعلق رکھنے والے فوجی بہت وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

صورتحال کی سنگینی کے پیش نظر میں نے ایک مزید بٹالین کے لئے درخواست کی' کیونکہ میرے بریگیڈ کی ایک بٹالین پہلے ہی الگ کی جا چکی تھی اور اگلے ہی دن میری یہ درخواست قبول کر لی گئی اور اگلے روز ایک نئی بٹالین بھیجنے کا وعدہ کیا گیا۔

اسی شام میں اپنے دو اسٹاف افسروں اور پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر فیض احمد فیض کے ہمراہ مری سے مظفر آباد کی طرف روانہ ہو گیا جب ہم مظفر آباد پہنچے تو شام سات بجے کا عمل ہو گا' وہاں جو منظر ہماری آنکھوں نے دیکھا وہ بالکل وہی تھا جس کی ہم توقع کر رہے

تھے۔ شہری آبادی اس علاقے سے فرار ہو رہی تھی۔ مظفر آباد اور چکوٹی کے درمیان سڑک پر لوگوں کے قافلے مظفر آباد کی طرف اپنی بھیڑ بکریوں اور دیگر ساز و سامان کے ساتھ ہجرت کر رہے تھے۔ ایک مقام پر میں نے فرنٹیر اسکاؤٹ کی دو پلٹنوں کو فرار ہوتے دیکھا اور یہ بات میرے لئے تعجب خیز تھی۔ میں نے انہیں روکا اور کہا کہ وہ واپس محاذ پر جائیں مگر انہوں نے یہ حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ بات فوجی قواعد و ضوابط کے خلاف تھی اور یہ لوگ باقاعدہ سرکاری تنخواہ دار ملازم تھے جن سے کسی ایسی حرکت کی توقع نہ تھی میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہاں کوئی ایسی خاص بات یا گڑبڑ اور خرابی ضرور ہے جو بظاہر نظر نہیں آتی تھی، ورنہ یہ لوگ برطانوی حکومت کے دور میں بھی اپنی بہادری، جنگ جوئی اور نظم و ضبط کے علاوہ سرکاری احکامات کو جاننے کے لئے خاص طور پر مشہور تھے، وہ کونسی چیز ہے جو انہیں یہ غیر معمولی رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہی ہے؟ خوش قسمتی سے اس وقت وہاں چند مسلح قبائلی بھی تھے جن کی بندوقوں کے اشارے پر میں نے ان سکاؤٹوں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا اور ان کے دو افراد کو زیر حراست لے لیا، باقی آدمیوں سے اسلحہ اور گاڑیاں چھیننے کے بعد انہیں اسی مقام پر انتظار کرنے کا حکم دیا۔

میں تھوڑا اور آگے بڑھا تو ایک فوجی میڈیکل افسر جیپ میں سوار اس علاقے سے فرار ہو رہا تھا میں نے اسے روک کر جیپ سے باہر نکالا اور اس کا طبی امداد کا سامان اٹھوایا اور حکم دیا کہ وہ پندرہ میل پیدل چل کر اپنے یونٹ میں واپس جائے اور اس کے پیچھے ایک سنگین بردار سپاہی کو لگا دیا تاکہ یہ میڈیکل افسر واپس نہ پلٹ آئے۔

چکوٹی میں بٹالین کمانڈر اور دوسروں کے حوصلے بلند تھے، مگر یہ عام تاثر پایا جاتا تھا کہ حالات امید افزا نہیں ہیں، چکوٹی وہ مقام تھا جہاں ہم نے نومبر میں طے کیا تھا کہ یہ بہترین دفاعی مورچہ ہے، اب یہ جگہ خوفناک بننے والی تھی، ہمیں اگلی صبح دن کی روشنی میں میدان میں اترنا تھا، کچھ فاصلہ تک پیچھے ہٹتے ہوئے میں اپنی جماعت کو ایک پہاڑی جگہ پر لے گیا اور ایک کھائی میں قیام کیا جو میرے خیال میں فضائی حملہ سے محفوظ مقام تھا۔ صبح کی روشنی ہوئی تو ایک حملہ آور طیارہ نے مشین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ کی، مجھے حیرت ہوئی کہ کشمیر میں سارے مقامات کو چھوڑ کر اس کھائی میں ہی کیوں گولیاں برسائی گئی ہیں۔ اس سوال کا جواب کچھ نیچے تھا، ہم رسد کے ایک مقام سے ذرا بلندی پر تھے، پھر مزید طیارے آئے، ایک لاری تباہ ہوئی اور ذخیرہ کے ایک حصہ کو آگ لگ گئی۔ ساران میں کچھ فاصلہ پر آگے ایک جھونپڑی کی چھت پر کسی نے سفید چادر اوڑھی ہوئی تھی، یہ کوئی فارسٹ افسر

تھا' اپنی جانب طیاروں کو نیچی پرواز سے آتے دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور چادر تھامے کچھ دیر بالکل اسی طرح کھڑا رہا جیسے بل فائٹر کپڑا لئے کھڑے رہتے ہیں' مگر فوراً ہی اس نے اپنی روش بدلی اور بروقت چھت سے کود گیا' مگر اس کی جیپ آگ کی نذر ہو گئی۔

تقریباً تین سو گز دور دو آدمی ظاہر ہوئے' وہ وردی میں تھے یہ ہمارے سکاؤٹ تھے جو اب میدان چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ میں نے چیخ کر ایک سٹاف افسر سے کہا کہ وہ انہیں روکے' مگر ایک طیارہ پہلے آگیا اور کھلے میں ان پر بم گرا۔

دشمن کے طیارے اس علاقہ پر مسلسل پرواز کر رہے تھے' ان کی زد سے کوئی چیز بچ نہ سکی' فاضل ٹرک' جھونپڑیاں' اکا دکا لوگ' فوجی' شہری--' پہلی مرتبہ وقفہ پا کر چکوٹی کی جانب دوبارہ بڑھا۔ سڑک سے کچھ فاصلے پر وردیوں میں کچھ لوگ نظر آئے' یہ وہ کمپنی تھی جسے میں۔ چھتیس گھنٹے پہلے مری سے بھیجا تھا کہ وہ دریا کو عبور کر کے دوسری جانب دشمن کو روکے رکھیں' بظاہر وہ دریا عبور کر کے آگئے تھے مگر دیہاتیوں سے یہ سن کر کہ دشمن پہلے ہی پہنچ چکا ہے۔ کمپنی کمانڈر اپنے لوگوں کو واپس سڑک کے پاس محفوظ جگہ پر لے گیا تھا۔ انہوں نے دشمن کو خود نہیں دیکھا تھا اور دشمن وہاں تھا بھی نہیں' میں نے دوربین سے اردگرد دیکھا' کہیں بھی کوئی نشانات نہ تھے۔ انہیں فوری طور پر دریا کے پار لیجانا تھا' مجھے دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا تب جا کر وہ پہلی پہاڑی پر پہنچے۔

چکوٹی پہنچ کر دفاعی مورچوں کا انتخاب کیا گیا اور ان پر کام شروع ہو گیا اب یہ طے کیا جانا تھا کہ نئی بٹالین کو کہاں تعینات کیا جائے جو رات کو وہاں پہنچنے والی تھی' اس مقصد کیلئے مجھے عام حالات کا جائزہ لینا تھا۔

جی ایچ کیو آزاد سے میرا بریگیڈ انٹیلی جنس افسر دشمن کے متعلق جو معلومات بھی لا سکتا تھا' لے آیا یہ کاپیاں تھیں جن میں اگلے مورچوں سے موصول ہونے والے پیغامات درج تھے جو چار ہفتوں کے دوران پکڑے گئے۔

ان لاتعداد پیغامات اور خبروں کو اچھی طرح چھان پھٹک کر دشمن کی قوت بلکہ ان کمپنیوں کے نام بھی جان لئے گئے اور اس طرح ایک واضح تصویر ہمارے سامنے تھی' جس کے مطابق دشمن کی تقریباً دو بریگیڈ فوج ہمارے مقابل تھی اس فوج کو توپ خانے اور ٹینکوں کا ایک یونٹ بھی تحفظ فراہم کر رہا تھا۔ جبکہ ایئرفورس کا ہم پہلے ہی مشاہدہ کر چکے تھے۔

جہاں تک اس علاقے میں دشمن کی فوجی قوت کا تعلق ہے یہ گیارہ بٹالین اس کے

علاوہ دو پیدل کمپنیاں، کشمیر ملیشیا، میدانی توپ خانے کی دو کمپنیاں، پہاڑی توپ خانے کی دو کمپنیاں، ایک ٹینک شکن توپ خانے کی کمپنی اور ہلکے ٹینکوں کے ایک سکواڈرن پر مشتمل تھی۔

اس تمام نفری کا شمار کیا جائے تو ان کی تعداد ایک ڈویژن سے زیادہ تھی مگر چونکہ اس علاقے میں بھارتی فوج کے صرف دو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر تھے، لہٰذا اس فوج کو مقررہ تعداد سے زائد دو بریگیڈوں ہی میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اری اور اس کے پیچھے کی سڑک کا تحفظ کرنے کے لئے دشمن نے دو یا تین بٹالین چھوڑی ہوں گی اور آٹھ یا نو بٹالین ہمارے مقابلے کے لئے سامنے آئیں گی۔

دشمن کی اس قوت کے مقابلے میں ہماری نئی بٹالین پہنچنے کے بعد بھی ڈھائی بٹالین ہوتی تھی جس میں مشین گن بردار سکاوٹ بھی شامل تھے۔

میں جانتا تھا کہ کچھ آزاد دستے اور کچھ قبائلی رضاکار بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں گے مگر فی الحال ہمیں اس قوت پر انحصار کرنا تھا۔ لہٰذا دشمن کے مقابلے میں ہماری قوت کچھ اس طرح تھی۔

	دشمن	ہم
عقب میں موجود پیدل فوجی دستے	دو سے تین بٹالین تک	ہماری ایک بٹالین سے بھی کم
میدان جنگ میں دشمن کی فوج	آٹھ سے نو بٹالین تک	ایک اور دو کے درمیان بٹالین
علاقہ جات	بٹالین	بٹالین
مشین گن	بارہ	چار
توپ خانہ	چوبیس	(کوئی نہیں) صفر
ٹینک شکن	بارہ	(کوئی نہیں) صفر
بکتربند گاڑیاں	نو	(کوئی نہیں) صفر
ہوائی حفاظتی فوج	بھارتی ایئر فورس	(کوئی نہیں) صفر

ہماری قوت کی یہ غیر متوازن صورتحال مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی کہ ہم کس طرح دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں، ہم خواہ کتنے ہی بہترین دفاعی مورچوں میں بیٹھے ہوں،

بھارتی قوت اپنی تعداد اور وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ہم پر بھاری پڑ سکتی ہے۔

ہمارے لئے یہی ایک بات مفید ثابت ہو سکتی تھی کہ دشمن کی زیادہ سے زیادہ فوجی قوت کو دائیں بائیں پہاڑیوں کی طرف الجھا دیا جائے تاکہ یہ انتشار انہیں اصل میدان جنگ میں پیش قدمی سے محروم کر دے۔ قبائلیوں کے سلسلے میں وہ نہ صرف فکرمند بلکہ خوفزدہ بھی تھے۔ اس لئے ان کا دائیں اور بائیں بازو کی جانب متوجہ ہونا یقینی امر تھا گو اس وقت علاقے میں قبائلی رضاکار موجود نہیں تھے، مگر باقاعدہ فوج کے کچھ سپاہیوں کو قبائلی رضاکاروں کی طرح استعمال کیا جا سکتا تھا، چونکہ بھارتی اس بات کو نہیں سمجھ سکتے کہ ہماری یہ کارروائیاں کچھ دنوں کی مہلت حاصل کرنے کے لئے ہوں گی اور جب تک توچ باغ روڈ مکمل نہیں ہو جاتی، ہمیں دشمن کو الجھائے رکھنے کے لئے یہ چھاپہ مار کارروائیاں اس طرح جاری رکھنی ہوں گی، کبھی کہیں اور کبھی کہیں سے، تاکہ دشمن چھاپہ ماروں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔

اس منصوبے کو بروئے کار لانے کے لئے میں نے دریا کی دونوں جانب ایک ایسے مقام کا انتخاب کیا جو دفاعی اعتبار سے بہترین ثابت ہو سکتا تھا۔ ان دونوں مورچوں پر ایک ایک بٹالین کو متعین کیا اور بقایا نصف بٹالین کو پہاڑی پر دشمن کی فوجوں کو ہراساں کرنے کا فریضہ سونپا، مجھے یقین تھا کہ یہ دونوں بٹالین اپنے مورچوں کے اعتبار سے دشمن کو بھاری نقصان پہنچا سکتی ہیں اور جب آزاد فوجی دستے اور قبائلی پہنچ جائیں گے۔ ہم دشمن کو دونوں بازوؤں سے مزید پریشان کر سکیں گے۔

دونوں دفاعی مورچوں کے لئے جگہ کا انتخاب کچھ دشوار نہ تھا کہ ایک مورچہ چکوٹی کے مقام پر پہلے زیر استعمال تھا، البتہ دوسرے مورچے کے لئے بب دودی کی پہاڑی چوٹی ہمارے مقصد کے لئے انتہائی موزوں تھی اس چوٹی کی بلندی چھ ہزار فٹ تھی، بلاشبہ یہ چوٹی چکوٹی سے پانچ میل پیچھے تھی، مگر موجودہ حالات میں ہم پانڈو کی پہاڑی پر ایسا مورچہ اس لئے نہیں بنا سکتے تھے کہ پانڈو اور چکوٹی کا درمیانی فاصلہ محفوظ نہ تھا حالانکہ پانڈو چوٹی کی بلندی نو ہزار فٹ تھی۔

بلاشبہ ایک مشکل یقیناً حائل تھی اور وہ یہ تھی کہ بوقت ضرورت ان دونوں میں سے کوئی ایک چوٹی بھی ایک دوسرے کی مدد نہیں کر سکتی تھی اور چکوٹی اور بب دودی کا درمیانی فاصلہ نہ صرف میدانی ہونے کی وجہ سے دشمن کی نظروں میں رہتا، جسے وہ گولہ باری سے نقصان پہنچاتا، مگر جس صورتحال سے ہم دوچار تھے اس میں ایسا خطرہ مول لینا ہی پڑتا۔

اکیس تاریخ کو جب میری بٹالین بھی پہنچ گئی تو دونوں دفاعی چوکیوں پر ایک ایک بٹالین متعین کرنے کے بعد نصف بٹالین کو چھاپہ مار کارروائیوں کے لئے روانہ کر دیا گیا۔

آئندہ چند روز کے دوران دشمن اپنے توپ خانے' ہوائی قوت کے سہارے بتدریج آگے بڑھتا رہا اور ہماری فوجیں قدم قدم پر دشمن کے راستے میں مزاحم ہوتی ہوئی قدم قدم پیچھے ہٹ رہی تھیں اور ہم بتدریج چکوٹی اور پھر بب دودی کی جانب پیچھے ہٹ رہے تھے۔

اسی دوران کچھ آزاد فوجی دستوں کے علاوہ قبائلی رضاکار بھی پہنچنا شروع ہو گئے اور اس طرح دشمن کو ہراساں کرنے کی ہماری کارروائیاں بتدریج موثر ہونا شروع ہو گئیں اور بھارتی فوجیوں پر دونوں جانب سے کی گئی چھاپہ مار کارروائیوں کے نتیجے میں دشمن انتشار کا شکار ہونے لگا' سامنے کی کارروائیوں کی تعداد میں صرف ہونے لگا۔ اسی طرح ہفتہ بھر یہ سلسلہ چلتا رہا اور ہم چکوٹی اور بب دوری میں اپنی چوکیوں پر ڈٹے رہے اور دشمن سامنے کی جانب سے حملہ کرنے کے لئے پر تولتا رہا۔

دشمن نے اسی دوران چکوٹی پر دو مرتبہ حملہ کیا مگر معلوم یہ ہوتا تھا کہ یہ دونوں حملے انتہائی عجلت میں کئے گئے تھے' یہ دونوں کوشش حقیقی معنوں میں حملہ کی بجائے کسی بڑے حملہ کی ابتدائی کاوشیں تھیں' میرا خیال تھا کہ دشمن کسی بڑے حملے سے قبل علاقے سے متعلق نہ صرف زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے' بلکہ وہ زیادہ سے زیادہ قوت کو بھی اکٹھا کرنے میں مصروف ہے' مگر حقیقت یہ تھی کہ دشمن کی زیادہ توجہ اب دائیں بائیں سے ہونے والی چھاپہ مار کارروائیوں پر مرکوز تھی' جس کی وجہ سے کوئی بڑا حملہ کرنے سے معذور تھا۔

دریا کی دوسری جانب بھی بھارتی فوج بجائے اس کے بب دودی کی چوکی کی طرف متوجہ ہوتی اور ہمیں وہاں سے نکالنے کی کوشش کر کے ہمیں گھیرنے کی کوشش کرتی ان کی تمام تر توجہ اپنے دائیں بائیں پھیلے ہوئے چھاپہ ماروں کو گھیرنے پر مرکوز تھی۔ ممکن ہے دشمن دائیں بائیں سے محفوظ ہونے کے بعد ہمیں گھیرنے کے لئے ہمارے عقب میں پہنچ کر ہمیں نقصان پہنچانا یا گھیرنا چاہتا ہو مگر ہم اس وقت ہم یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ دشمن کیا چاہتا ہے۔

علاقہ بہت وسیع تھا اور پہاڑیاں بہت بلند تھیں اور ان پہاڑیوں میں متعدد درے بھی تھے' لہٰذا ایسی تمام مخدوش جگہوں پر نگاہ رکھنا آسان نہ تھا' مگر جو مشکل ہمیں درپیش تھی وہی مشکل دشمن کی پیش قدمی میں رکاوٹ کا باعث بن رہی تھی۔ آزاد دستے اس سلسلے میں

ہماری مدد بھی کر رہے تھے اور معلومات بھی فراہم کرتے تھے' دیکھ بھال کے لئے جانے والی ان کی ٹولیاں جیسے ہی ہمیں خبردار کرتیں' ہم دفاعی پوزیشنوں پر پہنچ جاتے اور جیسے ہی ایک جگہ سے خطرہ ٹل جاتا' دوسری طرف متوجہ ہو جاتے اس طرح کئی ایک دن گزر گئے مگر آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ ہوا اور محاذ کی نوعیت جوں کی توں رہی۔

اسی کھیل کے دوران مزید قبائلی رضاکار پہنچ گئے اور میں نے انہیں پہاڑیوں کی جانب سے دشمن کے ہراول دستہ پر چھاپہ مار کارروائیوں کے لئے بھیجا مگر یہ قبائلی رضاکاروں کا دستہ اچانک ہراول دستے پر حملہ کرتے ہوئے بھارتی فوجوں کے عین درمیان گھس گیا اور تقریباً پھنس کر رہ جاتا مگر بھارتی فوجوں نے اس حملے کا مطلب کچھ دوسرا ہی لیا انہوں نے یہ سمجھا کہ ہماری جانب سے براہ راست حملہ کر دیا گیا ہے اور اب انہیں آگے بڑھنے کے بجائے اپنے دفاع کی فکر پڑ گئی۔ وائرلیس پر بھارتی افسروں کی گفتگو سے ہمیں یہ سب معلوم ہوا تو ہم نے بھی اس موقع کو اپنے لئے استعمال کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

دشمن کو مزید دہشت زدہ کرنے کے لئے ہم نے ان پر فائرنگ شروع کر دی اور ان پہاڑی گنوں کو بھی پہلی مرتبہ استعمال کیا جو حال ہی میں ہمیں موصول ہوئی تھیں اسی دوران قبائلیوں نے ایسے انداز میں حملہ کیا کہ دشمن مزید افراتفری کا شکار ہو گیا' پانڈو چوٹی کے سامنے دشمن کے فوجی دستوں پر ہماری مشین گنوں کے گولے گرنے لگے اور اس کے ساتھ ہی دشمن کی جانب سے بھی توپ خانے کا اس وسیع پیمانے پر استعمال شروع ہو گیا کہ پورا علاقہ روشنیوں میں نہا گیا اور میں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اب بب دودی تک ہمیں دشمن کی جانب سے سردست کوئی خطرہ نہیں رہ گیا۔

بلاشبہ دشمن کی فوجیں دریا کی دونوں جانب پہنچ چکی تھیں' مگر اب ان کی پیش قدمی تھم چکی تھی بھاری جانی نقصان نے انہیں اور بھی محتاط رہنے پر مجبور کر دیا تھا مگر ان کی عددی قوت اب بھی ہم سے بہت زیادہ تھی اس لئے کہ ہم نے اپنے قبائلی رضاکاروں کی چھاپہ مار کارروائیوں کو مزید موثر بنانے کے لئے علاقے کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لئے مزید ٹولیوں کو مرتب کرنا شروع کر دیا اسی طرح وقت گزرتا گیا اور بھارتی حملہ جس کا ہم انتظار کر رہے تھے کبھی نہ ہو سکا۔

اسی دوران شمال میں ٹیٹوال سے آگے بھارتی فوجوں نے ہمارے فوجیوں کی قلیل تعداد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو خاصہ پیچھے دھکیل دیا کیونکہ یہ لوگ نہ صرف تعداد میں بہت کم تھے بلکہ ان کے پاس رائفلوں کے علاوہ کوئی اور اسلحہ بھی نہ تھا تاہم بعد میں اس علاقے

کو ایک الگ سیکٹر کی تشکیل دیتے ہوئے وہاں بریگیڈیر حاجی افتخار احمد کو کمانڈر مقرر کیا گیا جسے میری ماتحتی میں کام کرنا تھا اور اس نئے سیکٹر کی تشکیل کے ساتھ ایک تازہ دم بٹالین اور دو پہاڑی مشین گنیں بھی وسط جون تک وہاں پہنچا دی گئیں۔

جون کے آخر تک یہ صورتحال بدستور اسی طرح رہی کیونکہ اب تک دشمن کے پانچ سے چھ سو فوجی ہلاک ہو چکے تھے اور ہم بدستور اپنی دفاعی چوکیاں میں ڈٹے ہوئے تھے اس لئے دشمن پیش قدمی سے قبل ہر طرح سے یقین کر لینا چاہتا تھا کہ حملے کی صورت میں وہ کامیاب رہیں گے مگر ہماری چھاپہ مار کارروائیوں نے جو اب دائیں بائیں کے علاوہ اور کسی وقت ان کے سامنے کے حصے میں بھی وقوع پذیر ہونے لگی تھیں انہیں اس حد تک انتشار کا شکار کر دیا کہ اب ان کی تمام تر توجہ اردگرد میں پھیلے ہوئے چھاپہ ماروں کے سدباب پر مرکوز ہو گئی اور ان کی جانب یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب حملے کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ اس وقت بھی ہم دفاعی مورچوں میں بیٹھے ہوتے تھے اور دشمن پیچھے نہیں ہٹا تھا۔

چکوٹی کے بالمقابل دریا کے دونوں جانب آٹھ تو بٹالین دشمن کی جو فوج حملہ کرنے کے لئے جمع ہوئی تھی اور اس کا بیشتر حصہ دائیں بائیں سے حملے کرنے والے چھاپہ ماروں کے باعث منتشر ہو چکا تھا وہ چھاپہ ماروں کی تلاش کے لئے اسی مربع میل کے رقبے میں پھیل گئے تھے ہمارے لئے اس امر کا فیصلہ کرنا بہت محال ہے کہ دشمن نے ہم پر حملہ کیوں نہ کیا تھا بلاشبہ ہماری چھاپہ مار کارروائیاں دشمن کے جانی نقصان اور ہماری طرف سے ایک آدھ حملہ بھی رکاوٹوں کا کچھ حصہ ہو سکتے تھے مگر ان تمام باتوں کے باوجود طاقت کا توازن جو دشمن کے حق میں تھا اس کے باوجود نہ جانے کیوں دشمن نے حملہ نہ کیا۔

اس طویل عرصے میں اس وسیع پیمانے پر بھارتی فوجوں کا اجتماع بارہ مولا سے چکوٹی کی جانب پیش قدمی اور پھر ٹیتوال اور پونچھ سیکٹر کی طرف ان کا بڑھنا اس امر کا واضح طور پر اشارہ تھا کہ بھارت مظفر آباد کو فتح کر کے اس جنگ کو ختم کر دینا چاہتا ہے اپنے ذرائع ابلاغ کی تشہیر میں بھارت نے کبھی بھی یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ یہ سب کچھ محض پاکستانی حملہ آوروں سے دفاع کے لئے کر رہا ہے جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ بھارت کے عزائم یہی تھے اور ان عزائم کی تکمیل کے لئے ہی بھارت نے یہ سب کچھ کیا تھا۔

اس حملہ کی منصوبہ بندی کرتے وقت بھارت نے بظاہر ہماری افرادی قوت، ہماری طرف سے مزاحمت کے انداز اور ہمارے وسائل کے علاوہ اس امر کا بھی بخوبی جائزہ لے لیا ہو گا کہ اس حملہ کی وجہ سے دونوں ملکوں کے مابین باقاعدہ جنگ بھی ہو سکتی ہے اس امر کا

دشمن اعلان بھی کر چکا تھا کہ وہ نہ صرف ہماری فوجی قوت' نقل و حرکت اور دفاعی حیثیت سے بخوبی آگاہ ہے بلکہ یہ کہ وہ پورے کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ سمجھتا ہے ان حالات میں اب دشمن مزید آگے بڑھنے میں دلچسپی نہیں رکھتا تو اس کی وجہ صرف اور صرف یہی ہو سکتی تھی کہ دشمن اب اس حقیقت کو جان چکا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا حالانکہ اس سلسلہ میں بھارت پر نہ تو کوئی بین الاقوامی دباؤ تھا اور نہ ہی اقوام متحدہ ابھی کچھ کرنے پر آمادہ تھی۔

حقیقت میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ دشمن کا انداز فکر کیا تھا تا ہم حالات اور واقعات کی روشنی سے صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا کہ جب دشمن ابتداء میں پیش قدمی کر رہا تھا تو انہیں کسی قسم کی شدید مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ ہر رکاوٹ تھوڑی سی کوشش سے دور کر لی گئی البتہ چکوٹی کے مقام پر انہیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ بھارت کو اپنے ہوائی جہازوں اور جاسوسوں کے ذریعے یہ اطلاع مل چکی ہو گی کہ چکوٹی میں ہماری صرف ایک بٹالین ہے اور جب ایک بٹالین ان کے لئے اس قدر شدید نتائج پیدا کر سکتی ہے تو مزید صورتحال کیا صورت اختیار کر سکتی ہو گی جب کہ یہ ایک بٹالین بھی توپ خانے یا فضائی تعاون سے محروم تھی دشمن اس بٹالین کو نہ تو منتشر کر سکا نہ پیچھے دھکیل سکا اور نہ ہی کسی دوسرے طریقے سے متاثر کر سکا۔

جنگی نقطہ نگاہ سے ہمیشہ سے یہ اصول سامنے رکھا گیا ہے کہ حملہ آور فوج کو دفاع کرنے والی فوج سے تقریباً تین گناہ طاقت میں ہونا چاہئے اور میرے خیال میں بھارت بھی اسی فارمولے پر عمل پیرا تھا کیونکہ ہماری ایک جانب دریا تھا جدھر سے وہ ہم پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے' سامنے کی جانب بہت گہرا نالہ اور ہمارا مضبوط مورچہ تھا جب کہ بائیں جانب طویل اور بلند پہاڑی چوٹیوں کو عبور کرنا اس طرف سے حملہ کرنے کے لئے بڑی بڑی بلند چوٹیوں کو عبور کرنا ایک اور بڑا مسئلہ تھا

بھارتی فوج نے یقیناً" یہ فیصلہ عقلمندی سے کیا کہ انہوں نے ہم پر سڑک کے راستے سامنے سے حملہ نہیں کیا کیونکہ اس صورت میں ان کی فوج کے آگے کا حصہ بھی یقیناً پیدل فوج کے دستوں پر مشتمل ہوتا اور کھلے میں غیر محفوظ ہوتا جسے نہ صرف چکوٹی کی جانب سے بلکہ دائیں بائیں بازوں سے چھاپہ مار بھی آسانی سے شکار کر لیتے کیونکہ ایک سو چھاپہ مار بھی ان کی بھاری نفری کو نہ صرف مشغول رکھ سکتے تھے بلکہ نقصان بھی پہنچا سکتے تھے گو

بھارت کے پاس کافی تعداد میں اسلحہ تھا اصل حملے کی صورت میں یا تو انہیں توپ خانے، اور فضائی تحفظ حاصل ہوتا اس طرح انہیں اپنے توپ خانے کی مشین گنوں کو آگے سڑک پر لانا پڑتا جو ایسی صورت میں ان کے لئے اور بھی غیر محفوظ ہو کے رہ جاتیں اس صورت میں بھی قبائلی چھاپہ ماروں کا خطرہ بدستور موجود رہتا اور توپ خانے کو ان چھاپہ ماروں سے محفوظ رکھنے کے لئے مزید کئی بٹالین فوج متعین کرنی پڑتی اور دشمن یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ان قبائلی چھاپہ ماروں کی تعداد کیا ہے اور یہ سلسلہ کہاں تک اور کب تک جاری رہ سکتا ہے جب کہ چکوٹی کو فتح کر لینا بھی کسی اہمیت کا حامل نہیں تھا اور اس پر بے پناہ جانی نقصان کا اندیشہ اپنی جگہ موجود تھا۔

چکوٹی کی تسخیر کے بعد بھی دشمن کو اسی طرح کی مزاحمت قدم قدم پر کرنی پڑتی اور جیسے جیسے دشمن آگے بڑھتا اس کے دائیں اور بائیں بازو وسعت اختیار کرتے جاتے جہاں قبائلی چھاپہ ماروں کی موجودگی دشمن کو منتشر کرتی اور بھارتی فوجیں قبائلی چھاپہ ماروں سے نبٹنے کے لئے دور دور تک پھیل جاتیں اور یہ بات فوجی نقطہ نگاہ سے بھارتی فوج کو مزید کمزور کرنے کا باعث بن جاتی چکوٹی کے باہر کوئی دوسرا مورچہ اور یہ سلسلہ بہت عرصہ تک جاری رہتا جبکہ ہماری باقاعدہ فوج کی وہ بٹالین جو کہ دشمن کے بالکل سامنے تھیں وہ ابھی محفوظ اور بہتر حیثیت میں تھی واقعی اگر مظفر آباد کو فتح کرنے کے لئے کوئی بڑا حملہ کرنا چاہتا تو اس مقصد کے لئے اسے بہت بھاری تعداد میں مزید تازہ دم فوج کی ضرورت تھی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس ضرورت میں اضافہ ہونا ناگزیر تھا۔

اتنی بھاری تعداد میں فوج کا اس محاذ پر لانا اس لئے ممکن نہ تھا کہ یہاں صرف ایک تنگ سڑک تھی جس پر آگے بڑھنے اور حملہ کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا اور گرد طویل اور بلند پہاڑی سلسلہ اس امر میں مانع تھا۔ ایسے علاقے میں بھاری تعداد میں فوج کا لانا کسی مخصوص حدف ہی کے لئے مناسب سمجھا جاتا ہے اور یہاں حدف صرف تنگ سڑک پر آگے بڑھنا تھا جس کے راستے میں ہماری باقاعدہ بٹالین اس کے راستے میں سخت رکاوٹ تھی بھارتی فوج مزید قریب پہنچ بھی جاتی تو ہمیں بھی آزاد فوجی دستوں کے علاوہ باقاعدہ پاکستانی فوج کی جانب سے امداد مل سکتی تھی۔

بھارتی رہنماؤں نے یقیناً نہیں سوچا کہ بھارتی فوج اس وقت تک آگے نہیں بڑھ سکتی جب تک پاکستانی فوج ان کی راہ میں حائل ہے اور کیونکہ پاکستانی فوج کو اس راستے یا مسئلے سے الگ نہیں رکھا جا سکتا لہٰذا محض چکوٹی جیسے غیر اہمیت کے حامل مقام کے لئے اس قدر

جانی و مالی نقصان بیکار ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے یعنی مظفر آباد فتح نہیں کر سکتے۔

دوسری طرف ہمیں یہ اندازہ ہو گیا کہ اگر کچھ مخصوص حالات آزاد فوجی دستوں کی بہترین تنظیم اور پاکستانی فوج کی جانب سے مناسب معاونت حاصل ہو جائے تو ہم خود دشمن پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں ہو سکتے ہیں۔

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ بھارت نے اس علاقے میں ناکامی کے بعد پاکستان کے میدانی علاقے کی طرف کیوں رخ نہ کیا؟ میرے خیال میں بھارت کو اس حملہ سے روکنے کے لئے بین الاقوامی رائے عامہ اور اس کے نتیجے میں بیرونی دباؤ یا اقوام متحدہ کے خوف سے زیادہ یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اگر بھارت نے پاکستان کے میدانی علاقے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو وہاں بھی انہیں پاکستان کی اسی قسم کی فوج اور قبائلیوں کا سامنا کرنا ہو گا جو اس وقت ان کی نظر میں مہم جوئی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

بھارتی رہنماؤں کے ذہنوں میں قبائلی چھاپہ ماروں کا کس قدر خوف اور ان کے دلوں پر کس قدر دہشت چھائی ہوئی تھی اس کا اندازہ وی۔ پی۔ مینن کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے وہ کہتے ہیں "کہ جب مہاراجہ کی طرف سے ریاست کا بھارت کے ساتھ الحاق اور فیصلہ سامنے آیا تو میرے ذہن میں صرف ایک ہی خیال جاگزین تھا کہ شمال مغرب کی طرف سے ان قبائل کی بھارت پر یلغار کو کس طرح مستقبل میں روکا جا سکتا ہے کیونکہ شمال مغرب کی طرف سے ہندوستان پر ان قبائل کے حملے ہندوستان کی تاریخ میں کوئی نئی بات نہ تھی صرف محمود غزنوی نے ہی ہندوستان پر سترہ مرتبہ حملے کئے گو یہ آٹھ سو سال پرانی بات ہے اور اس کے بعد مغلوں کے دور میں یہ سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا تھا مگر قبائلی ہمیشہ سے سرینگر یا دوسرے علاقوں کو روندتے ہوئے ہمیشہ دہلی تک پہنچنے کی کوشش کیا کرتے جس میں وہ اکثر کامیاب بھی ہو جاتے اور اب جب کہ پاکستان کی آزاد مسلم مملکت کو وجود میں آئے ابھی دو ہفتے ہی گذرے تھے یہ سلسلہ از سر نو شروع ہو گیا اور اس مرتبہ بھی ان قبائل کا یہی نعرہ تھا کہ آج سرینگر اور کل دہلی' بقول مینن "جو قوم اپنی تاریخ کو فراموش کر دیتی ہے مزید مشکلات کو دعوت دیتی ہے"۔

حقیقت کچھ بھی ہو مگر اب صورتحال یہ تھی کہ پاکستان اگر اپنی زیادہ سے زیادہ فوجیں پنجاب کے میدانوں سے ان دور دراز پہاڑی علاقوں میں بھی لاتا تو یہ ایک سنہری موقع تھا۔

میرا خیال یہ تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اگر ہم نے پاکستانی فوجوں کو

لانے سے احتراز کیا تو یہ ہماری غلطی ہو گی کیونکہ یہ بات اب تسلیم کی جا چکی تھی کہ کشمیر میں حالات کچھ بھی ہوں بھارت باقاعدہ جنگ کرنے سے خود گریزاں ہے لہٰذا پاکستان کے میدانی علاقوں کو اب چونکہ جنگ کا خطرہ نہیں اس لئے ہماری بھرپور توجہ کشمیر پر ہی ہونی چاہئے۔

باب ۱۳

پانڈو پر قبضہ

ہندوستانیوں کی جانب سے جارحانہ کارروائی ختم ہو چکی تھی، لیکن اوڑی کے محاذ پر جنگ ابھی بند نہیں ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں، چھاپے، بمباری اور فضائی حملے روزمرہ کے معمول بن گئے تھے دونوں جانب بھاری نقصانات ہو رہے تھے۔ اگر ہماری زندگی مزید چند ہفتے یا مہینے یونہی گزرنی تھی تو ظاہر ہے کہ ہماری دفاعی صورت حال کی اصلاح نہایت ضروری تھی۔

گزشتہ تین ہفتوں کے دوران میں ندی کی دوسری جانب پانڈو کی پہاڑیوں کی ڈھلان میں پہاڑی توپ خانہ کا ایک حصہ ہمیں بالکل ہی نظرانداز کرتے ہوئے چکوٹی اور اس کے عقب میں پانچ میل لمبی سڑک کے ساتھ ہماری پوزیشن پر حاوی ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ رات کے وقت نقل و حرکت غیر محفوظ ہو چکی تھی۔

ندی کی دوسری جانب پہاڑی توپ خانہ کے اس خاص حصہ کے بارے میں اب تک کوئی تدبیر نہ کی جا سکی تھی کیونکہ ان سے علیحدہ طور پر موثر انداز سے نپٹنا ممکن نہیں تھا۔ اگر ہم پانڈو پر قبضہ کر لیتے تو ان کا وجود ختم ہو جاتا اور ہمارے آدمی خود بھی یہی چاہتے تھے۔ لیکن یہ تو خاصہ بڑا کام تھا۔ جس کا انجام وہی ہمارے وسائل سے باہر بلکہ ہمارے مقصود سے بھی باہر تھی، کیونکہ ہمیں تو سختی کے ساتھ صرف مدافعت کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ بہرحال اب ڈویژنل کمانڈر نے اس کی اجازت دے دی تھی۔ پانڈو گاؤں کا نام ہے اور اس پہاڑی کا بھی نام ہے جس کی نو ہزار فیٹ بلند چوٹی پر یہ گاؤں آباد ہے۔ یہ پہاڑ دراصل ایک طویل کوہستانی سلسلہ ہے۔

اگر کوئی بب ڈوری کی بلندی پر کھڑا ہو کر پاندو کے مقابل دشمن کی فوج پر نظر ڈالے تو دائیں جانب تین ہزار فیٹ نشیب میں دریائے جہلم نظر آئے گا اور دریا کے دوسری طرف اصل سڑک دکھائی دے گی، جو پہاڑی کے پہلو میں کاٹ کر نکالی گئی ہے۔ سڑک سے آگے پہاڑیاں سات آٹھ فیٹ اونچی ہوتی گئی ہیں۔

بب ڈوری کی بائیں جانب ننگا ٹیک دکھائی دے گا جو بب ڈوری کے مقابل دس ہزار فیٹ بلند ہے اس کے آگے روزی کنا ۱۱٫۵۰۰ فیٹ کی بلندی پر واقع ہے اس کے کسی قدر سامنے سنگ ہے یہ جگہ ۱۰۵۰۰ فیٹ اونچی ہے۔

یہاں سے عین سامنے اگر دیکھا جائے تو ایک طویل سلسلہ کوہ دریا کے تقریباً متوازی پھیلا ہوا نظر آئے گا۔ اس کے قریب قریب وسط میں ایک مرغزار کے درمیان پنڈو نامی گاؤں واقع ہے۔ برسات کے زمانہ میں یہاں کہرا بادل چھائے رہتے ہیں۔

اگر ہم پانڈو میں یہ دیکھنے کے لئے کہ وہاں کی زمین کیسی ہے' پیدل جانا چاہتے تو ہمیں بب ڈوری کی چھ ہزار فیٹ بلندی سے دریا کے کنارے ۲۵۰۰ فیٹ نشیب میں جانا پڑتا' اس علاقہ میں جھاڑیاں یا درخت کچھ زیادہ نہیں' لیکن چٹانوں اور نالوں کی آڑ میں چھپ کر ہم پانڈو سے نظر نہیں آئیں گے۔ بب ڈوری کے نشیب میں پہنچ کر ہمیں ایک چشمہ عبور کرنا پڑے گا۔ جس میں بارش کے زمانہ میں سیلاب آ جاتا ہے۔ چشمہ کے عین سامنے ایک اونچا پہاڑ دائیں سے بائیں طرف پردے کی طرح تنا ہوا ہے۔ اس کی تین چوٹیاں ہیں جو ۶۳۰۰ فیٹ سے ۷۰۰۰ ہزار فیٹ تک اونچی ہیں۔ پہاڑ درختوں سے ڈھکا ہوا ہے اور اس کی تینوں چوٹیوں پر ہندوستانی فوجوں کا قبضہ ہے۔

بائیں چوٹی سے ایک درہ نکلتا ہے یہ کوئی ڈیڑھ میل طویل ہے اور پانڈو تک جا پہنچتا ہے۔ یہ تنگ پہاڑی راستہ ہے صنوبر کے گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا ہے یہ جگہ اتنی تنگ و تاریک ہے کہ سامنے سے کچھ نظر نہیں آتا اور آگے بڑھنا' نہایت دشوار ہوتا ہے۔ اس پہاڑی درے کے ساتھ ساتھ اگر کوئی پانڈو پر حملہ آور ہو تو یہ لڑائی بڑی سخت ہو گی۔ کیونکہ ہر چھوٹے چھوٹے پڑاؤ پر جوابی حملہ جو بھی ہو گا سامنے اور بلندی سے ہو گا اور اس دوبدو مقابلے میں دفاع کرنے والے فریق کو مقابلتاً" زیادہ آسانی میسر ہو گی۔ اب ہم ہندوستانی فوجوں کو دیکھتے ہیں کہ عین اس درہ کے وسط میں ایک مورچہ سنبھالے بیٹھی ہیں۔

یہاں سے مزید کچھ دور پانڈو کی طرف جاتے ہوئے درے کے ساتھ کچھ اور راستے دائیں اور بائیں جانب آ کر ملتے ہیں۔ یہ سب بھی گھنی جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے ہیں ڈھلوان ہیں اور نہایت تنگ ہیں۔ ہندوستانیوں نے ان راستوں پر بھی کچھ چوکیاں قائم کر رکھی ہیں۔ پانڈو سے ذرا پہلے ہی درختوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور ہم بلندی پر ایک سبزہ زار میں آ نکلتے ہیں یہ قطعہ ۵۰ سے ۲۰۰ گز تک چوڑا اور ۷٫۸ سو گز لمبا ہے' اس کی بلندی پر بھی ہندوستانیوں کا قبضہ ہے اور ان پر اگر حملہ کرنا مقصود ہو تو اس قطعہ زمین کو

طے کر کے بلندی پر جانا پڑے گا۔ اس جگہ حملہ آور کو دفاعی فوجوں کی بھرپور گولہ باری کا سامنا کرنا پڑے گا اور اس کا نتیجہ نہایت ہولناک ہو گا۔

پانڈو کے مقام پر درے سے دو شاخیں نکلتی ہیں۔ اس کا دایاں حصہ ۹۳۰۰ فٹ تک جا نکلتا ہے جس کے مقابل دریا ہے اور اس سے آگے سڑک ہے اور وہاں سے قریب چکوٹی میں ہمارے فوجی دستے متعین ہیں۔ درے کی بائیں شاخ دو میل لمبی ہے' پھر اس کی بھی دو شاخیں بن جاتی ہیں۔ ایک ۱۰ ہزار فیٹ کی بلندی پر چھوٹا قاضی ناگ تک اور دوسری ہمارے مزید بائیں جانب ۱۴۵۰۰ فیٹ کی بلندی پر قاضی نگ تک جا پہنچتی ہے۔

جب ہم نے پانڈو کا حوالہ دیا تو اس سے ہماری مراد آس پاس کا یہ سارا علاقہ ہے پانڈو کو مقامی طور پر دونوں طرف سے بلحاظ حکمت عملی جو اہمیت دی گئی تھی۔ اس کا اندازہ صرف اسی حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ ہم نے اسے دہلی' کا علامتی نام دیا تھا اور بعد میں دشمن کی دستاویزات سے منکشف ہوا کہ انہوں نے بھی اس کا نام "کراچی" رکھا تھا۔ مقامی باشندے بھی پانڈو کو نہایت اہمیت دیتے تھے۔ ان لوگوں میں ایک داستان مشہور تھی کہ چند صدی پہلے کسی مغل شہنشاہ کی فوجوں کو یہاں روک دیا گیا تھا اور اس کے بعد مغل درہ پر پنجال کے راستے یہاں سے چلے گئے تھے یہ لوگ اس وہم میں مبتلا تھے کہ پانڈو ناقابل تسخیر ہے۔

اس علاقے میں دشمن کی بطور مجموعی طاقت ہم سے زیادہ تھی' لہذا ہماری کامیابی کی یہ ایک ہی صورت تھی کہ کسی بہت ہی نازک جگہ پر حملہ کریں تاہم وہ ایسی جگہ ہو کر دشمن وہاں اپنی پوری طاقت بروئے کار نہ لا سکے۔ یہ امکان پانڈو گاؤں میں ہی نظر آتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑی کلیدی جگہ تھی۔ یہاں دشمن کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہاں دشمن کا سارا دماغ کام کر رہا تھا اور یہیں سے پورے علاقہ پر اس نے اپنا کنٹرول قائم کر رکھا تھا۔

چکوٹی اور بب ڈوری میں ہماری اپنی دفاعی پوزیشن بڑی مستحکم تھی۔ اس کلیے کی رو سے حملہ آور کی طاقت دفاع کرنے والوں کی طاقت سے تین گناہ زیادہ ہونی چاہئے' ہندوستان کو ہماری ایک بٹالین پر حملہ کرنے کے لئے تین تین بٹالینوں کا پورا بریگیڈ درکار ہوتا۔ دشمن کی طرف کسی جگہ بھی بٹالین کی اتنی مضبوط پوزیشن نہیں تھی' اس کے برعکس دشمن کی طاقت چھوٹی چھوٹی ٹکریوں کی صورت میں سارے علاقے کے اندر جگہ جگہ بکھری ہوئی تھی۔ انہیں اپنی طاقت کو کچھ تو اس لئے منتشر کرنا پڑا تھا کہ ہماری سرگرمیاں خاصے وسیع پیمانے پر انہیں ہراساں کئے دے رہی تھیں اور کچھ انتشار کا سبب ان کی ناقص

حکمت عملی بھی تھی۔ وہ ایک ایک جگہ پر ایک ایک یا دو دو کمپنیوں کی صورت میں بیٹھے تھے اور بسا اوقات' ان کے ٹھکانوں کے درمیان فاصلہ اتنا زیادہ ہوتا کہ ان کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرنا ممکن نہ تھا۔

ہمیں یہ نظر آتا تھا کہ خود پانڈو گاؤں پر آدھی بٹالین فوج کا قبضہ ہے۔ اب اگر یہاں حملہ کرنا مقصود ہو تو نظری علم کی رو سے ہمیں اپنے حملے کے لئے ڈیڑھ بٹالین کی ضرورت ہو گی اور ہوا یہ کہ اس ساری کارروائی کے لئے میں' جس قدر فوج تیار کر سکا' وہ سب ملا کر یہی ڈیڑھ بٹالین کے برابر تھی۔ چونکہ اس کے ایک حصے کو "ریزرو" میں رکھنا پڑے گا' لہٰذا صرف ایک بٹالین فوج بچ رہے گی' اس کا مطلب یہ ہوا' کہ ہماری برتری کا تناسب ایک کے مقابلے میں صرف دو کا ہو گا لیکن آزاد فوجوں اور قبائلیوں کو ملا کر یہ طاقت کافی ہو گی۔ اب اصل مسئلہ یہ تھا کہ راستے میں دشمن کے دوسرے دستوں سے بچتے ہوئے ہم اپنے ہدف تک کس طرح پہنچیں' ہمارے اور پانڈو کے درمیان سات ہزار بلند پہاڑیوں کا حصار تھا جن پر بھارتی کمپنیوں کا قبضہ تھا۔ آگے بائیں جانب سنگ پر اور دو کمپنیاں تھیں پانڈو جانے والے چھوٹے چھوٹے راستوں پر بھی اسی قسم کے انتظامات تھے' اگر ہم ان میں سے کسی جگہ پر حملہ کرتے تو ہمیں اپنی ساری طاقت کو مجتمع کرنا پڑتا اور ہماری پوزیشن بھی کسی اعتبار سے بہتر نہ ہوتی اور اگر کسی نہ کسی طرح سے پانڈوں پر ہم قبضہ کر لیتے تو ہمارے ہراول دستوں کو پسپائی پر مجبور ہونا پڑتا۔

یقینی طور پر پانڈو ساری صورت حال کی کنجی تھا اور یہی ہدف بھی تھا۔ کرنل ہاروے کیلی تک ہمارے آدمیوں نے سراغرسانی کر کے حملہ کی منصوبہ بندی کی تھی ۱۷ جولائی کو میں نے حملہ کا حکم دیا۔ اسی روز لیفٹیننٹ کرنل ہاروے کیلی کو کشمیر سے واپس بلا لیا گیا کیونکہ برٹش افسروں کو کارروائیوں میں حصہ لینے کی اجازت نہ تھی۔ لیفٹیننٹ کرنل ملک شیر بہادر نے چارج لیا۔ مندرجہ ذیل ۷/۱۰ بلوچ کی ایک کمپنی 1/15 پنجاب (ایم ایم جی) کی ایک پلٹن' خیبر رائفل کی دو پلٹنوں' (۲) آزاد بٹالین کی دو کمپنیوں' تین قبائلی لشکروں اور ۷۱ فیلڈ کمپنی (انجینئرز) کی ایک پلٹن کمان میں دی گئیں۔

ہمارے سراغرساں دستوں نے بتایا کہ ایسا ہو سکتا ہے تاہم اپریشن میں چال یہ ہو گی کہ رات کے وقت دشمن کے محاذ کو عبور کرنا ہو گا۔ اس کے مورچوں کے درمیان کافی فاصلہ طے کر کے تاریکی میں ۶ ہزار تک کی بلندی کو عبور کیا جائے گا اور پھر حملہ سے قبل کہیں آرام کیا جائے گا۔ یہ سب کچھ ایک رات میں نہیں ہو سکتا تھا اس کام کے لئے دو

راتیں درکار تھیں اور اس کا مطلب یہ ہو گا کہ دو راتیں اور ایک دن ہمیں دشمن کے علاقہ میں رہنا ہو گا اس کی فرنٹ لائن سے پیچھے اور ہمیں مکمل طور پر چھپ کر رہنا ہو گا یہ ۳۶ گھنٹے کے دوران سنگین خطرہ مول لینا تھا کیونکہ اگر اس کا انکشاف ہو جائے تو باقی فوج سے ہم کٹ جائیں گے اور شاید ہم پکڑے بھی جائیں

میں نے اس خطرے کو قبول کر لیا کیونکہ اس کے بغیر کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔

حملے کی تیاریوں میں چند دن گذر گئے۔ سپلائی اور اسلحہ آگے لے جانا تھا۔ راستہ بنانے والوں نے دریائے جہلم کے آر پار ایک تار بچھا دیا۔ اس تار کے سہارے ایک ٹوکری بیک وقت دو آدمیوں کو یا ۳۰۰ پونڈ وزنی سامان کو لے کر دوسرے کنارے پر لگ جاتی تھی۔ سامان کے ذخائر کو ڈھو کر آگے لے جانے کے لئے قلیوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ قلی اکٹھا کر لئے گئے تھے اور اس مہم میں انہیں دو ہزار کی تعداد میں استعمال کیا گیا۔ توپ خانہ کو اس جگہ تک پہنچایا گیا جہاں سے دشمن صاف زد میں آتا تھا۔ ہمارے پاس نو ہزار گولے تھے اور جس قدر گولے دشمن کے پاس تھے۔ اس کے مقابلے میں یہ تعداد بہت کم تھی خیال تھا کہ دشمن ہم پر صرف ایک دن میں تین ہزار گولے پھینکے گا۔ تین ہزار محسود قبائلی ہمارے ساتھ تھے۔ سو سو کے حساب سے ان کے تین لشکر بنائے گئے۔ پہلے دو لشکر کے ذمے یہ کام تھا کہ دشمن پر چھاپہ مار کر اسے ہراساں کریں، جب کہ لشکر سوئم کو خاص فریضہ یہ سپرد ہوا کہ ہم اگر دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیں تو وہ ان کا پیچھا کریں۔ آخری مرحلہ میں بب ڈوری کے سامنے چشمے پر لکڑی کا ایک پل تیار کرنا تھا۔ ۱۷ جولائی تک ہم اس مہم کے لئے تیار ہو چکے تھے۔

دوسرے دن، غروب آفتاب کے بعد ہماری حملہ آور فوجی بٹالین نے چشمہ عبور کر لیا اور نہایت خفیہ طریقے سے دشمن کے علاقے میں گھس گئی۔ بارش نے نقل و حرکت میں رکاوٹ ڈال رکھی تھی، لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ بارش کے شور میں بہت سی ناگزیر آوازیں دب کر رہ گئیں۔ ہمارے آدمی جوں جوں آگے بڑھتے گئے، ٹیلیفون کی لائن تمام راستے بچھاتے گئے، اس طرح بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز میں ہمارے ساتھ ان کا رابطہ قائم رہا۔ وائرلیس سیٹ بھی آگے پہنچا دیئے گئے تھے، لیکن انہیں صرف ہنگامی حالت میں استعمال کرنے کے لئے بند رکھا گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد وہ اپنے خفیہ اڈے پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ دشمن کی پہلی لائن سے تقریباً ایک میل پیچھے تھے۔ اس دوران میں کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔

دوسرے دن جو کارروائی کا دوسرا روز تھا حملہ آور بٹالین کو اپنے مرکز پر نصف شب تک چھپ کر بیٹھے رہنا تھا اس کی اگلی کارروائیاں رات کو شروع ہونا تھیں' ہمارا توپخانہ بھی خاموش تھا۔ تاکہ یہ تاثر دیا جائے کہ کوئی غیر معمولی نقل و حرکت نہیں ہو رہی تاہم اسی صبح میں نے قبائلیوں' آزاد فوجیوں اور سکاؤٹوں پر مشتمل چھاپہ مار پارٹیاں ترتیب دیں اور مختلف مقامات پر ان سے کھلم کھلا کام لیا۔ یہ کام احتیاط کے ساتھ بھی کیا جا سکتا تھا اور توقع نہ تھی کہ اس سے کوئی شک پیدا ہو گا۔ وہ دن ابر آلود تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ چھاپہ مار پارٹیوں نے دشمن کو الجھائے رکھا اور سوائے ایک رقوعہ کے جو خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ایک جاسوس دستہ حملہ آور فوج کے خفیہ مرکز سے دشمن کے گشتی دستہ کے قریب جا پہنچا' دستہ فوری طور پر واپس پلٹ گیا مگر اس کا گائڈ کیچڑ میں پھسل کر گرا اور دشمن کے ہتھے چڑھ گیا وہ اسے پکڑ کر اپنے ہیڈ کوارٹرز پانڈو میں لے گئے جہاں اس سے تفصیلی پوچھ گچھ کی گئی مگر خوش قسمتی سے اس نے کچھ نہ بتایا' کافی تشویش کے بعد شام کو ہمیں یقین ہو گیا کہ حالات ٹھیک ہیں اس لئے دوسری شب فورس اپنی دوسری کارروائی کے لئے تیار تھی۔

باب ۱۴

انڈین ائر فورس

جنگ کے پورے دور میں ایک عنصر، جس سے دشمن کو برابر تقویت ملتی رہی، فضائیہ کا استعمال تھا۔ چونکہ ہمارے پاس کوئی بمبار طیارہ یا طیارہ شکن توپیں طویل عرصہ کے لئے موجود نہ تھیں۔ اسی لئے ہندوستانی فضائیہ کے طیارے پورے کشمیر کی فضا میں حسب منشا پرواز کرتے رہے اور ان کی موجودگی میں، اس علاقے کا کوئی گوشہ محفوظ نہ تھا۔ ہمارے ذرائع مواصلات کے لئے نقل و حرکت کا امکان صرف رات میں تھا، یہاں تک کہ دوسری سرگرمیاں بھی بیشتر اندھیرے کے اوقات تک محدود تھیں۔ جولائی ۱۹۴۸ء کے اوائل میں چنیاری کے مقام پر مجھے ۴۰ ایم ایم بوفرز کی دو طیارہ شکن توپیں، پہلی بار دستیاب ہوئیں۔ یہ توپیں صرف دو دو پونڈ کے گولے پھینک سکتی تھیں اور ان کی مار بہت محدود تھی۔ توپیں چونکہ بہت بھاری تھیں، اس لئے انہیں صرف بڑی سڑک کے قریب کھڑا کیا جا سکتا تھا۔ اور بڑی سڑک یا شاہراہ اس علاقے میں ۳ ہزار فیٹ کی بلندی پر واقع تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کی پہاڑیاں ۷ ہزار سے ۱۰ ہزار فیٹ تک اونچی تھیں اور ان کی موجودگی میں دور تک دکھائی بھی نہیں دیتا تھا۔ لہذا دشمن کا طیارہ توپ کی زد میں آتے ہوئے صرف چند ثانیوں کے لئے نظر آتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ ان توپوں سے ہم ایک بھی طیارہ کو مار کر نہ گرا سکے۔ اپنا حوصلہ بلند رکھنے اور جنگ آزمائی کا ولولہ تازہ رکھنے کے لئے دشمن کے طیاروں پر موثر جوابی حملہ کرنا ضروری تھا۔ لہذا میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کے طیاروں کو نشانہ بنانے کے لئے جگہ جگہ جال بچھا دیئے۔ ان کارروائیوں میں سے ایک کا حال میں یہاں بیان کرتا ہوں۔

ہمارا یہ خیال تھا کہ دشمن کو کسی متوقع حملے کا تاثر دیا جائے۔ دشمن اس سے مجبور ہو کر اپنے طیاروں کو بعض علاقوں پر پرواز کے لئے بھیجے گا، جہاں ہماری مشین گنیں بلندی پر پہلے سے متعین ہوں گی، چنانچہ انہیں اپنا شکار بنا لیں گی۔ لہذا ابتدائی کارروائی کے طور پر میں نے درمیانہ درجہ کی ایک توپ (آرٹیلری) چکوٹی کے مقام پر انتہائی اگلے مورچوں کے

قریب کھڑی کر دی۔ یہ توپ جو ۹۰ پونڈ کا گولہ پھینکتی تھی ان تمام توپوں میں سب سے بھاری تھی، جو دونوں طرف کی فوجیں اس جنگ میں استعمال کر رہی تھیں۔ چکوٹی سے اوڑی کیمپ ٹھیک اس توپ کی زد میں آتا تھا۔ ابھی تک وہاں کوئی گولہ جا کر نہیں گرا تھا اور ہندوستانی فوج کو ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ ہم ان پر گولہ پھینک سکتے ہیں۔ لہٰذا اوڑی کیمپ میں ان کے خیمے اور گاڑیاں ہمیشہ کھلے آسمان تلے کھڑی رہتی تھیں اس کارروائی کے لئے میں نے اسی (۸۰) گولے بچا رکھے تھے اور توقع تھی کہ ان سے دشمن کو بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا۔ دشمن کو گمان یہ ہو گا کہ یہ گولہ باری، اصل حملہ کی ابتدا ہے۔ اس کے بعد ہمارے فوجی دستوں کی طرف سے مزید فائرنگ اور ان کی نقل و حرکت کی بنا پر دشمن کو یہ تاثر دیا جائے گا کہ بری فوج کا حملہ عنقریب ہوا چاہتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ یہ سب کارروائی جونہی ہو گی، ہندوستانی فوج، فوراً فضائی امداد طلب کرے گی۔ ہمیں اس راستے کا بھی پتہ تھا، جس طرف سے ہندوستانی طیارے بالعموم پرواز کر کے آتے تھے، اسی راستے کی سب سے اونچی یعنی ۹ ہزار فیٹ کی چوٹی پر بارہ مشین گنیں اور سولہ برین گنیں، دشمن طیاروں کو نشانہ بنانے کے لئے متعین کر دی گئیں۔ ان اسلحہ بردار سپاہیوں کو بروقت آگاہ کرنے کے لئے ایک خاص طریقہ وضع کیا گیا اور بریگیڈ کے باقی لوگوں کو بھی تاکید کر دی گئی کہ ان کے اسلحہ کی زد میں جو بھی طیارہ آئے اسے نشانہ بنائیں۔

گولہ باری کی ہدایت دینے کے لئے توپ خانہ کا ایک افسر پانڈو پہاڑی کی ۹۳۰۰ فیٹ اونچی چوٹی پر متعین تھا۔ جہاں سے اوڑی کیمپ صاف نظر آتا تھا۔ جب تمام لوگ اپنی اپنی جگہ جم کر بیٹھ گئے۔ تو ہم یہ انتظار کرنے لگے کہ آسمان بالکل صاف اور موسم سازگار ہو جائے تاکہ طیاروں کو موسم کی خرابی کی وجہ سے پرواز میں تامل نہ ہو۔ دوپہر کے وقت آسمان بالکل صاف تھا۔ اسی وقت گولہ باری شروع ہو گئی۔ اوڑی کیمپ پر یہ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ اس سے دشمن میں زبردست کھلبلی مچ گئی، اس کے فوراً بعد دوسری سرگرمیاں شروع ہو گئیں چنانچہ دشمن کی پیغام رسانی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً گھنٹہ بھر کے اندر، ایک طیارہ آ پہنچا، لیکن وہ بیشتر وقت چنیاری کے آس پاس، جہاں توپیں پہلے رکھی گئی تھیں اور وہاں اب کوئی جال موجود نہ تھا، پرواز کرتا رہا۔ اس طرح رات ہونے تک کچھ بھی حاصل نہ ہوا، لیکن جب رات ہوئی تو دشمن کو غالباً یہ تشویش ہوئی کہ دن کا یہ ہنگامہ آخر کس لئے تھا، چنانچہ دوسری صبح انہوں نے تین طیارے ایک ساتھ پرواز کے لئے بھیجے اور وہ پانڈو پر حملہ کی نیت سے آ پہنچے، کیونکہ ایسی

جوابی کارروائیوں کے لئے یہ ان کی پسندیدہ جگہ تھی۔ ہمارے آدمیوں کو پہلے ہی خبردار کر دیا گیا۔ ہمارا جال ابھی وہیں تھا اور پورا بریگیڈ انہیں ہاتھوں ہاتھ لینے کے لئے تیار تھا۔

طیارے وہاں پہنچتے ہی یکے بعد دیگرے گردش کر کے ڈبکی لگاتے گئے۔ پہلا طیارہ جونہی نیچے آیا' اسے ایک مشین گن نے نشانہ بنا لیا۔ طیارہ چکر کھا کر چکوٹی سے ذرا ہی دور دھماکے سے جا گرا۔ دوسرا طیارہ پہلے کے بالکل پیچھے اڑ رہا تھا۔ چنانچہ اس سے بھی دھواں اٹھتا ہوا دیکھا گیا۔ جس وقت دونوں طیارے زمین کی طرف جا رہے تھے' ان میں ایک ہوا باز نے پیرا شوٹ کی مدد سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد دونوں طیارے مجھے خود بھی نظر نہیں آئے۔ بظاہر نظر آتا تھا کہ دونوں گر کر تباہ ہو گئے اور دوسرا ہوا باز نیچے اتر گیا۔ میرا خیال یہ تھا کہ نیچے اترنے والا وہ پہلا ہوا باز تھا' لیکن اگلے مورچے کے سپاہیوں نے ہمیں ایک بالکل مختلف قصہ سنایا۔ انہوں نے بتایا کہ گولہ صرف پہلے طیارے کو جا کر لگا تھا۔ اور اس کا پائلٹ طیارے کے ساتھ ہی نیچے جا گرا تھا لیکن دوسرے طیارے کے پائلٹ نے جو ایک سکھ تھا۔ اپنا کام وقت سے پہلے ہی کر ڈالا اور اپنے طیارے سے خود بھی کود پڑا اور اسے یہ خیال نہ آیا کہ یہ کام تو دراصل پہلے طیارے کے ہواز کو کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال یہ کہانی چاہے کسی نے گھڑلی ہو' لیکن بہرحال بہت مقبول ہوئی۔

باب ۱۵

پونچھ کی امداد

ہندوستان نے سرما کی آمد سے پہلے مظفر آباد کی طرف جو پیش قدمی شروع کی تھی، اس میں ناکامی کے بعد، اس نے دوسرے حملے کی تیاریاں شروع کر دیں، اب کے، اس کی ابتدا جموں سے ہوئی، جہاں سے ہندوستانی فوجیں مغرب اور شمال کی طرف بڑھیں تاکہ پونچھ پر مخالف فوجوں کا دباؤ کم ہو۔ اس معاملہ سے مجھے ذاتی طور پر کوئی تعلق نہ تھا، لیکن میں اس کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کروں گا تاکہ متارکہ جنگ تک کے حالات کی مکمل تصویر سامنے آ جائے۔

جموں سے مغرب کی طرف ایک کچی سڑک پاکستانی سرحد کے تقریباً متوازی (سرحد یہاں سے بمشکل چند میل جنوب میں ہے) نوشہرہ اور اس سے بھی آگے جاتی ہے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں جب ایک ہندوستانی بریگیڈ اس سڑک سے آگے بڑھا تھا تو آزاد کشمیر کے دستے اسے روکنے میں ناکام رہے تھے، چنانچہ ہندوستانی بریگیڈ نوشہرہ جا پہنچا تھا جہاں ریاستی فوج کا ایک گیریژن پہلے سے موجود تھا۔ اس جگہ سے ہندوستانیوں نے میرپور پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ قصبہ نوشہرہ کے مغرب میں منگلا ہیڈ ورکس کے قریب واقع ہے۔ جہاں سے اپر جہلم کینال نکلتی ہے۔ یہ کوشش ناکام ہو گئی تھی اور ہندوستانی فوج کو نوشہرہ کے آس پاس روک دیا تھا۔ کم و بیش انہی دنوں یہاں سے مزید کچھ دور شمال میں کوٹلی کے مقام پر ریاست کے باغیوں نے ریاست کے فوجی گریژن کو زیر کر کے اس قصبہ پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ اس کے بعد سے اگست ۱۹۴۸ء تک، اس علاقہ کی یہی صورت حال باقی رہی، یعنی ہندوستان کی فوجیں نوشہرہ میں اس کے عقبی سڑک تک محصور رہیں اور سڑک کے دونوں طرف کے علاقوں پر آزاد کشمیری سپاہیوں کا قبضہ رہا۔

یہاں سے مزید شمال میں پونچھ ہے، جو پونچھ جاگیر کے حکمراں کی راجدھانی ہے۔ پونچھ جاگیر میں پنجابی بولنے والے تقریباً ۳ لاکھ ۸۲ ہزار مسلمان اور ۳۹ ہزار غیر مسلم آباد ہیں گذشتہ جنگ عظیم میں، برطانوی ہند کی فوج میں جو کشمیری بہ تعداد کثیر شامل ہوئے تھے، ان

کی اکثریت (ایک بیان کے مطابق تقریباً ۸۰ ہزار) اسی آبادی سے گئی تھی۔ یہاں کے لوگ اگرچہ غیر مسلح تھے۔ لیکن پھر بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور بغاوت کے ابتدائی چند ہفتوں کے اندر ہی، انہوں اس سارے علاقہ کو مہاراجہ کی فوجوں سے خالی کرا لیا تھا، البتہ پونچھ کے قصبہ کو آزاد کرانے میں انہیں ناکامی ہوئی تھی۔

ریاستی فوجوں نے اور ایک کثیر تعداد میں غیر مسلموں نے اس قصبہ میں پناہ لی تھی اور کھائیاں کھود کر ان کے اندر اپنے آپ کو محصور کر لیا تھا۔ ریاست کے الحاق کے فوری بعد، ہندوستان نے مزید فوج اس قصبہ میں تعینات کر دی تھی۔ اس کے بعد سے یہ سڑک بند ہو گئی۔ اور ہندوستان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ پونچھ کو سپلائی طیاروں کے ذریعے برقرار رکھے۔

مئی ۱۹۴۸ء میں جب ہندوستان نے اوڑی سے موسم گرما کے حملے کا آغاز کیا تو اس وقت ان کا ارادہ غالباً یہ بھی تھا کہ اپنا اصل مقصد حاصل کرنے کے بعد پونچھ کو مخالف فوجوں سے آزاد کرائیں گے۔ لیکن ان کی جارحانہ یورش ناکام ہو گئی اور ہم نے اوڑی پونچھ روڈ کو اس تمام عرصے میں سختی سے بند رکھا۔ جولائی کے آخری دنوں میں پانڈو پر ہمارے قبضے کے بعد، جب اس علاقے کی صورت حال جوں کی توں باقی رہی تو اس وقت بھی پونچھ کے گرد ہمارا محاصرہ باقی رہا اور یہ قصبہ ہندوستانی فوج سے کٹا رہا۔

اگست ۱۹۴۸ء میں متارکہ جنگ کے متعلق اقوام متحدہ کی تجاویز بالآخر تکمیل کو پہنچیں اور ۱۳ تاریخ کو ایک سکیم دونوں حکومتوں کو پیش کی گئی۔ دو ہفتوں کے بعد اگرچہ اس مضمون کا اعلان ہو گیا کہ مذکورہ سکیم اپنی موجودہ صورت میں ناقابل قبول ہے اور اپنی نئی تجاویز اور ترامیم پیش ہوتی رہیں، تاہم اتنا صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ جلد یا بدیر، متارکہ جنگ کا نفاذ ضروری ہے۔

عین ممکن ہے کہ ہندوستان اس وقت پونچھ کی صورت حال سے سخت پریشان رہا ہو، کیونکہ متارکہ جنگ کے موقع پر اگر پونچھ آزاد علاقے میں رہتا اور ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کے باقی علاقوں سے کٹ گیا ہوتا تو آزاد کشمیر میں اس کی حیثیت گویا ایک یرغمال کی ہوتی۔ آزاد علاقے کے لوگ اسے ہندوستان پر دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال کرتے اور اس صورت میں کہ رائے شماری کرانے کے متعلق ہندوستان کی طرف سے کسی ناواجب تاخیر یا غیر مخلصانہ روش کا مظاہرہ ہوتا تو دھمکی کے طور پر اس علاقے میں دباؤ ڈالا جا سکتا تھا۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ جلد رائے شماری ہو۔ کیونکہ اس کے نتیجہ میں کامیابی کا ہمیں پورا یقین

تھا۔ لیکن فوری رائے شماری' ہندوستان نہیں چاہتا تھا۔ اسے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے مزید وقت درکار تھا' چنانچہ ہندوستان کے نقطۂ نظر سے جتنی زیادہ دیر ہوتی' اتنا ہی اچھا ہوتا۔ لیکن اتنا تو ظاہر ہی تھا کہ اس عرصے میں پونچھ کا بطور یرغمال ہمارے قبضے میں رہنا' ہندوستان کے نقطۂ نظر سے نہایت غیر دانش مندانہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان نے اگرچہ وعدہ کیا تھا کہ صورت حال کو مزید ابتر نہ ہونے دیں گے۔ لیکن ہندوستان نے متارکہ جنگ کے نفاذ سے پہلے پونچھ پر قبضے کی تیاریاں کرتا رہا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا' چونکہ اس کا علم مجھے براہ راست طور پر نہیں۔ اس لئے میں صرف وہ خبریں بیان کروں گا۔ جو ان دنوں اخبارات میں شائع ہوئی تھیں۔ یہ علاقہ جہاں گذشتہ چند مہینوں سے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اب زبردست سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہاں دشمن کی فوجی تیاریوں کی خبر ۲۴ اگست ۱۹۴۸ء کو پہلی بار ملی' نوشہرہ سیکٹر میں کئی جگہوں پر ان کی مورچہ بندی دیکھی گئی تھی۔ ایک مہینے بعد ۲۴ ستمبر کو اس مضمون کی خبریں ملیں کہ ہندوستان نوشہرہ کے شمال میں راجوڑی کے مقام پر فوجی طاقت جمع کر رہا ہے۔ چنانچہ وہاں کچھ جھڑپیں بھی ہوئیں۔ ۱۰ اکتوبر کو دشمن نے بھاری طاقت کے ساتھ راجوڑی کے شمال مشرق میں حملہ کر دیا تھا۔ لیکن وہاں سے انہیں پسپا کر دیا گیا۔ دو دن بعد اس جگہ پر مزید جھڑپیں ہوئیں ۱۹ اکتوبر کو راجوڑی میں زبردست لڑائی چھڑ گئی معلوم ہوا کہ دشمن کی طاقت اس جگہ ایک پورے بریگیڈ کے برابر ہے۔ اسی روز نوشہرہ کے شمال مغرب میں لڑائی کی خبر ملی جہاں کے بارے میں معلوم ہوا کہ دشمن مزید کمک پہنچا رہا ہے۔

۲۶ اکتوبر کو پونچھ کا ہندوستانی گیریزن بھی حرکت میں آگیا۔ چار دن بعد آزاد کشمیر کے صدر سردار ابراہیم نے پاکستان کے عوام سے ان الفاظ میں امداد کی درخواست کی "ہماری سرفروشانہ جدوجہد نہایت غیر مساعد حالات میں جاری رہی ہے' لیکن پاکستان کے عوام نے آزاد کشمیر کے سپاہیوں کو محاذ پر زندہ رکھنے کے لئے خوراک ' لباس اور دوسری اشیائے ضروری کی امداد پابندی کے ساتھ فراہم نہ کی تو اس بات کا پورا خدشہ ہے کہ یہ جدوجہد ناکام ہو جائے۔

۲ نومبر کو اخبارات کی رپورٹوں میں بتایا گیا تھا کہ ہندوستان نے اس سیکٹر میں کئی جگہوں پر آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی ۳ نومبر کو راجوڑی چنگاس روڈ پر آزاد فوجوں کی کھڑی ہوئی رکاوٹوں کی بنا پر دشمن کی پیش قدمی رکی رہی۔ پریسہ اور کٹھ گلی کے مقام پر متحارب فوجوں میں تصادم بھی ہوا۔ ۵ نومبر کو راجوڑی کے شمال میں مزید لڑائیاں ہوئیں۔ ۸

نومبر کو ہندوستانی فوج راجوڑی کے شمال مغرب میں نمودار ہوئی ۱۱ نومبر کو ہندوستانی ٹینک محاذ پر موجود تھے۔ ۱۱ تاریخ کو تازہ حملے شروع ہو گئے ۱۵ تاریخ کو مزید کمک آ پہنچی۔ ۱۸ تاریخ کے اخبارات کی شہ سرخیاں یہ تھیں "ہندوستان کشمیر میں زبردست حملے کی تیاریاں کر رہا ہے" "جموں میں کم سے کم دو بریگیڈ اور آرٹیلری کی دو رجمنٹیں مزید کمک کے طور پر پہنچا دی گئیں" کہا جاتا تھا کہ مجموعی طور پر تین ڈویژن فوجیں ریاستی' پونچھ ایریا میں کارروائی کر رہی ہیں۔ جن کا ہیڈ کوارٹر نوشہرہ میں ہے یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہندوستان نے کوٹلی اور مینڈھر کی طرف ایک زبردست چڑھائی شروع کر دی ہے۔

۲۰ نومبر کو مینڈھر کی وادی میں ایک زبردست خون ریز جنگ ہوئی۔ کہا جاتا تھا کہ پونچھ گیریزن حصار توڑ کر باہر نکلنا چاہتا تھا۔ صاف اشارہ ملتا تھا کہ یہ ان کی کارروائی کا نقطہ عروج ہے۔ اس کے ایک یا دو ہی دن کے اندر پونچھ کا قبضہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس طرح ہندوستانیوں نے نوشہرہ کا رابطہ پونچھ سے قائم کر لیا اور اس لائن کے مشرقی جانب کا سارا علاقہ' جس میں مینڈھر تحصیل بھی شامل ہے اور جسے وادی کشمیر کا اناج گھر کہتے ہیں' ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ چند دنوں بعد ۲۸ ہزار مہاجر جہلم (پاکستان) میں وارد ہوئے اور مزید ان کے بعد آنے والے تھے۔

پونچھ پر ہندوستان کا قبضہ' وہ سب سے بڑا نقصان تھا' جو ہمیں جنگ میں برداشت کرنا پڑا تھا۔ اور یہ نقصان اس لئے ہوا کہ ہم نے اس علاقے کو مزید کمک نہیں پہنچائی اور نہ ایسا کوئی منصوبہ بنایا گیا کہ جس قدر وسائل موجود ہیں' انہی سے مدافعت کی سنجیدہ کوشش کی جائے۔

ہندوستان حملے کے لئے خاصے عرصے سے طاقت اکٹھی کر رہا تھا۔ ہماری حکومت کو یہ بات معلوم تھی۔ پاکستانی افواج کے جنرل ہیڈ کوارٹر کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ اور یہ عوام کے بھی علم میں تھی۔ بریگیڈیئر اعظم خاں (جو بعد میں لیفٹیننٹ جنرل ہوئے) جو اس سیکٹر کے کمانڈر تھے' حکام بالا کو اس سلسلے میں مفصل رپورٹیں بھیج رہے تھے' لیکن نہ تو انہیں مزید دستے مہیا کئے گئے اور نہ اس بارے میں کوئی ہدایت ملی کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔

اس نوعیت کے متوقع خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے' صورت حالات کا ایک بے حد محتاط تجزیہ ضروری تھا' اور یہ بات بھی لازمی تھی کہ دشمن کے عزائم اور اس کی ممکنہ پیش قدمی کے متعلق صحیح پیشین گوئی کی جائے۔ اس طرح کی معاملہ فہمی' فوجی کارروائی کا یقینی معمول اور لازمی عنصر شمار ہوتی ہے۔ صرف اسی طرح یہ تخمینہ لگایا جا سکتا تھا کہ خطرے

سے نپٹنے کے لئے کس قدر طاقت درکار ہو گی یا وہ کون سا علاقہ یا علاقے ہیں، جنہیں باقاعدہ جنگ کے بغیر چھوڑا جا سکتا تھا۔ عام حالات میں اس طرح کے فیصلے کو کسی فوجی کمانڈر کی صوابدید پر چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا فیصلہ تو حکومت کرتی۔

ایسا بھی نہیں کہ ہندوستان کی کارروائی ہمارے لئے حیران کن اور غیر متوقع تھی۔ ہندوستان کی تو ہمیشہ سے خواہش تھی کہ پونچھ پر قبضہ کر لے۔ اور اس کی بارہا کوشش وہ پہلے بھی کر چکا تھا۔ اگست ۱۹۴۸ء میں جب متارکہ جنگ کی تجاویز آنی شروع ہوئیں، انہی دنوں منطقی طور پر یہ بات مزید صاف ہو چکی تھی کہ ہندوستان متارکہ جنگ کے وقت پونچھ کو خط متارکہ کے دوسری طرف، ہمارے علاقے میں چھوڑنا نہیں چاہے گا۔ اس کے بعد حملے کے لئے ان کی تیاریاں اس قدر طول پکڑ گئیں اور وہ طویل محاذ، جس پر انہیں حملہ کرنا تھا، یعنی سو میل سے زیادہ مسافت، اس کے پیش نظر ہمیں اتنی مہلت مل گئی کہ اگر ہم چاہتے تو آنے والے خطرے سے نپٹ سکتے تھے۔

صرف ایک وجہ، جو بعد ازاں سننے میں آئی، یہ تھی کہ ہمارے پاس فالتو فوجی دستے نہ تھے۔ اس کے باوجود دو ہی ہفتے بعد جب عام لوگوں نے، جنہیں پونچھ کی ناکامی سے شدید صدمہ پہنچا تھا، اخبارات میں جب حیرت اور تاسف کا اظہار کیا تو ہم کوئی ۲۵ ہزار افراد کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جن میں آزاد کشمیری، قبائلی اور باقاعدہ فوج کے جوان شامل تھے۔ دستے کے پاس پاکستانی توپ خانے کی غالباً ۵۰ توپیں بھی تھیں۔ اس دعوے سے انکار کرنا مشکل ہے کہ اس نفری کا اگر ایک ہی جز کچھ پہلے مہیا کر دیا جاتا تو ہندوستان کا پونچھ کے ساتھ تعلق قائم نہ ہو سکتا تھا پھر خاصی منصوبہ بندی اور تیاری کے بعد فوج حملے کے لئے تیار تھی اور ہم اس حالت میں تھے کہ اگر چاہتے تو جموں اور پونچھ کے درمیان مواصلات کے طویل سلسلے کو درمیان سے منقطع کر دیتے۔ نوشہرہ سے آگے، ہندوستان کی کثیر افواج کا وجود ہی سرے سے خطرے میں پڑ چکا تھا۔

تب یہ ہوا کہ ایک صبح، دسمبر کے پہلے ہفتے میں، زبردست بمباری کی گئی اور پانچ ہزار گولے پھینکے گئے۔ لیکن حملہ نہیں ہوا۔ اگر اس جگہ سے حملہ بھی کر دیا جاتا تو ہندوستانیوں کا جموں میں، ان کے مرکز سے رابطہ ختم کر دیا جاتا۔ تاہم ایسا کیوں نہیں کیا گیا۔ اس کا ایک ہی سبب سننے میں آیا کہ اس کارروائی سے جنگ ختم ہونے میں نہ آتی اور ہندوستانی فوج کو جو بھاری نقصان ہوتا۔ محض اس کی وجہ سے یہ اندیشہ تھا کہ ہندوستان، بجائے خود پاکستان کے خلاف اعلان جنگ پر مجبور ہو جاتا۔ اصل سبب اگر یہی ہے تو سوال کیا جا سکتا

ہے۔ کہ ابتدائی منصوبہ بندی کے مرحلے میں یا تیاری کے دو ہفتوں کے دوران میں کیا اس خطرے کا امکان' ہمارے بالاتر حاکمان مجاز کے ذہنوں میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ جب بمباری شروع کر دی گئی۔ اس کے بعد ہی یہ حقیقت ان پر دفعتاً" کس طرح منکشف ہوئی۔؟

اس طرح پونچھ کے لئے ہندوستان سے کٹ جانے کا خطرہ تو دور ہو گیا۔ لیکن ہندوستانی فوجوں کو ابھی اور بھی اندیشے در پیش تھے۔ نوشہرہ سے آگے ۱۰۰ میل تک ان کی فوج کے ایک پورے حصے کو خطرے کا کھلا سامنا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ آنے والے زمانے میں' قبائل اور آزاد کشمیری فوجیوں کے لئے حملہ کرنے' چھاپہ مارنے اور ہندوستان کے فوجی قافلوں اور چوکیوں پر ہلہ بولنے کے مثالی مواقع موجود ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اس کی حیثیت ہندوستانی فوج کے جسم میں بہتے ہوئے زخم کی ہو گی۔ اور اسے اس اندیشے کا بھی سامنا ہو سکتا ہے کہ بدن کا سارا خون بہہ جائے اور بے جان جسم خالی پڑا رہ جائے۔ لیکن دسمبر ۱۹۴۸ء کے آخر میں جنگ بندی کے بعد وہ اس برے وقت سے بھی بچ گئے۔

۳۱ دسمبر ۱۹۴۸ء کو نصف شب میں' طرفین نے جنگ بند کر دینے کا حکم صادر کیا اور جنگ بند ہو گئی۔ یہ متارکہ جنگ نہ غیر متوقع تھی اور نہ اچانک۔ دراصل کئی مہینے پہلے سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ جنگ بند ہو کے رہے گی اور اس مسئلہ کا تصفیہ دوسرے ذرائع سے کرنا پڑے گا۔ آزاد کشمیر کے لوگوں نے بھی یہ کبھی امید نہیں کی تھی کہ ہندوستان کو طاقت کے بل پر کشمیر سے باہر پھینک سکتے ہیں۔ وہ محض اس قدر چاہتے تھے کہ ایک منصفانہ استصواب پر ان کا دعویٰ اور حق تسلیم کر لیا جائے۔ یہ حق اب تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لہٰذا متارکہ جنگ کا فیصلہ اصولی طور پر اچھا تھا۔ تاہم ہم میں سے بعض لوگوں کے نزدیک متارکہ جنگ کے لئے جو خط کھینچا گیا تھا۔ وہ نا قابل اطمینان معلوم ہوتا تھا' کیونکہ بظاہر اس خط کی بنا پر' وہ سب کچھ ہندوستان کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ جس کی اسے آرزو تھی۔

کشمیر کی وادی' لداخ اور جموں کو بچانے کے لئے ہندوستان اب اور کوئی علاقہ' پہاڑی یا اہم جگہ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ جس کی آرزو کرتا۔ کشمیر کے ساتھ رسل و رسائل اور مواصلات کے لئے کٹھویا روڈ ہندوستان کے پاس پہلے ہی موجود تھی اور پاکستان کی سرحد سے خاصی دور' مزید ایک سڑک اس غرض سے زیر تعمیر تھی۔ مختصر یہ کہ ہمارے قبضے میں کوئی ایسا مرکز یا عنصر نہیں تھا۔ جو ان پر دباؤ ڈالنے یا انہیں مجبور کرنے کے لئے استعمال میں آتا اور اگر ہندوستان' استصواب میں تاخیر سے کام لیتا یا اس سے انکار کرتا تو اس دباؤ

کو ہم اس کے حوصلہ شکنی کے لئے کام میں لاتے۔ متارکہ جنگ کے معاہدے کی دفعات میں بھی کوئی ایسی بات شامل نہ تھی۔ استصواب کے لئے کوئی مدت بھی معین نہیں ہوئی تھی۔ اقوام متحدہ نے باہمی سمجھوتے کے لئے محض خیر سگالی کے جذبے سے کام لیا تھا۔ اس نے کشمیر کے مسئلہ کو کبھی اپنی ذمہ داری نہیں سمجھا اور دباؤ ڈالنے یا کارروائی کرنے کے لئے ضمانت یا ایسا کوئی وعدہ موجود نہ تھا جسے استصواب کے لئے استعمال کیا جاتا۔ لہٰذا ہندوستان کو اس بات کی پوری پوری ترغیب مل رہی تھی کہ اگر چاہے تو معاملات کو بجنسہ چھوڑ دے اور پھر ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہے کہ تمام تر ہندوستان کے جذبہ خیر سگالی پر انحصار کریں کہ وہ اگر چاہے متارکہ جنگ کے سمجھوتے کی اصل روح کا احترام کرے۔ لیکن ہمیں چونکہ یقین تھا کہ کشمیر کے عوام پاکستان کے حق میں ووٹ دیں گے، لہٰذا اس کے معنی یہ ہوئے کہ استصواب کا اہتمام کرکے، ہندوستان گویا کشمیر کو پلیٹ میں رکھ کر ہماری نذر کر دے گا۔ ریاست پر قبضہ کے لئے، ہندوستان نے جو سخت لڑائی چھیڑ رکھی تھی کیا اس کے بعد اس طرح کی توقع کا کوئی منطقی جواز باقی رہ جاتا ہے۔

اس کے باوجود اگر کچھ دو اور کچھ لو کا جذبہ کسی روز دونوں ملکوں کے درمیان پیدا ہوتا تو اس کی توقع بھی کی جا سکتی تھی، لیکن کسی ایسے جذبے کا اظہار بھی ممکن نظر نہ آتا تھا کیونکہ دو اور لو" کے معنی یہ ہیں کہ کچھ دینا ہوتا ہے اور کچھ لینا ہوتا ہے اور وہاں ہندوستان کو لینے کے لئے اب باقی کیا رہ گیا تھا۔ جو کچھ بھی لینے کی چیز تھی، مثلاً جوناگڑھ اور حیدر آباد، وہ ہندوستان نے پہلے ہی ہتھیا لیا تھا۔ لہٰذا متارکہ جنگ کے معنی بظاہر یہی نظر آتے تھے کہ ہم امید پر تکیہ کرکے بیٹھ رہیں۔۔ امید یہ کہ قسمت غیر معمولی طور پر ہمارے لئے سازگار بن جائے یا ہندوستان غیر معمولی فیاضی پر آمادہ ہو جائے۔

کچھ عرصہ بعد میں نے انہی خطوط پر یہ کوشش کی کہ ہم نے خود کو جس کمزور پوزیشن میں ڈال رکھا ہے، اس کی سنگینی سے وزیراعظم کو مطلع کروں۔ اگر انہوں نے مجھ سے یا کسی اور شخص سے جو عملاً جنگ میں شریک رہا ہو، مشورہ کیا ہوتا تو انہیں یقیناً بہتر مشورہ ملتا۔ ٹھیک ہے کہ یہ میرا حق نہ تھا کہ مجھ سے مشورہ کیا جاتا، لیکن میں ان معدودے چند افراد میں شامل تھا جو ابتدا سے ہی جنگ میں شریک تھے، لہٰذا مقامی جغرافیائی کیفیت، اور عام صورت حالات کے بارے میں، میری معلومات سے بہتر استفادہ کیا جا سکتا تھا۔

ہم سب کو علم تھا کہ جنگ بندی بہرحال ہونی ہے، لیکن جنگ بندی، اگر ایک ماہ پہلے منظور کر لی جاتی تو اس وقت پونچھ کا علاقہ بطور یرغمال ہمارے ہاتھ میں ہوتا۔ یا اس وقت

باب ۱۷

اب کشمیر کو کیسے آزاد کرایا جائے؟

استصواب رائے کے ذریعے کشمیری عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق پہلے ہی اقوام متحدہ اور دنیا نے تسلیم کر رکھا ہے' مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اندرونی طور پر اس مطالبہ پر زور دیں' وہ یہ کچھ کر بھی رہے ہیں مگر ان کی کوششوں کی باہر سے اخلاقی اور مادی امداد بھی ہونی چاہیے۔ جذباتی ہمدردیوں کی کوئی کمی نہیں ہے' کشمیری عوام اپنے لئے ایسا خود بھی کر سکتے ہیں۔ ایسی امداد مختلف ذرائع اور مناسب وقت میں مقبوضہ کشمیر کے اندر پہنچ سکتی ہے۔

جنوری ۱۹۴۹ء کے بعد سے طویل تعطل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کئی پاکستانی سمجھنے لگے ہیں کہ جنگ کے بغیر استصواب رائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ کہ ایسی کسی بھی جنگ میں نقصان ہمارا ہو گا' یہ دونوں شبہات بے بنیاد ہیں' اولاً" یہ جنگ کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ہم جارحیت کا ارادہ نہیں رکھتے' اور نہ ہی اس قسم کی دھمکی دیتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے واقعات سیاسی اور دفاعی حکمت عملی سے غفلت کے معاملات تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اعلیٰ قیادت نے انتہا درجہ کی نااہلی کا ثبوت دیا' ثانیاً' بھارت نے کسی جواز کے بغیر جارحیت کا ارتکاب کیا تھا مگر یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ساری دنیا چپ بیٹھی رہے گی اور ہماری مدد کو نہیں آئے گی۔ نہ ہی ہم اتنے کمزور ہیں جتنا ظاہر کر رہے ہیں' دوسری جانب ہمارے وسائل کے موازنہ سے صاف ظاہر ہو گا کہ بھارت کا نقصان ہم سے زیادہ ہو گا' جنگ ہو یا امن' جو کچھ کرنا ضروری ہوتا ہے اس کا فیصلہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب متعلقہ وقت اور اس وقت کے حالات پیش نظر رکھے جائیں۔

۱۹۴۷-۴۸ء کی طرح' ایک وقت کشمیر کی جانب سے پاکستان کی فوجی مداخلت اور مسلح امداد ضروری تھی' بعد میں جب اس قسم کی امداد کے دروازے سیز فائر لائن کے باعث بند ہوئے اور بھارت نے وعدہ کے مطابق استصواب سے روگردانی کر لی تو یہ ضرورت پیدا ہوئی کہ لوگوں کو سیاسی طور پر ابھارا جائے اور ان سے مادی اور اخلاقی امداد کی حمایت حاصل کی

جائے اب جبکہ لوگ بیدار ہو چکے ہیں' انہیں اپنا وطن آزاد کرانے کیلئے امداد کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کام پچاس کے عشرہ کے شروع میں ہوتا تو خفیہ طور پر چھوٹے چھوٹے حصوں میں یہ سیز فائر لائن کے اس جانب پہنچ سکتی تھی اور طویل عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہ سکتا تھا' کافی وقت گزر جانے کے بعد اب وہ مرحلہ آ گیا ہے کہ تحریک آزادی' جو اب ایک نئی نسل کے ہاتھ میں ہے' مستحکم ہو چکی ہے اب وہ اس قابل ہے کہ مطلوبہ سمت میں اسے لیجا سکے اور دنیا کے کئی ملکوں میں آزادی کی تحریکوں جیسے طریقے اور مثالیں اختیار کر کے ان سے فائدہ حاصل کر سکے مگر اس کا سب سے اہم حصہ جس کی ہر طرح سے حمایت کی جاتی رہے گی وہ ہے جب یہ پاکستان کی فوجی مداخلت کے خیال سے خود کو دور رکھے گی۔ اس طرح تحریک آزادی کی باقاعدہ نشوونما ہو گی اور یہ تحریک تادیر قائم رہے گی۔ کسی بھی تحریک آزادی کو یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ موجودہ حکام کی جانب سے تشدد نہیں ہو گا' مگر کشمیری عوام کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ ان کے مقصد کو اقوام متحدہ اور ساری دنیا نے تسلیم کر رکھا ہے۔ مزید براں اسلامی ملکوں کے وسائل چند سال پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ اور کشمیر کی تحریک آزادی کی رسائی میں ہیں' تاہم یہ امداد کشمیر کے شہریوں کو خود طلب کرنی چاہئے' مقبوضہ کشمیر سے باہر رہنے والے کشمیری اس امداد کو وصول اور استعمال کرنے میں آزاد ہیں جب تک کہ وہ مرحلہ نہ آ جائے کہ بھارت کو اپنا وعدہ پورا کرنے یا دنیا کو مداخلت کیلئے کہا جائے۔

دریں اثناء' سیز فائر کے بعد کشمیر کا لمبا سایہ نہ صرف کئی افراد پر پڑا بلکہ پورا ملک اس کی لپیٹ میں آیا' کئی افراد جان گئے کہ اس نے ہماری ان پالیسیوں اور کاموں پر کس حد تک اثر کیا اور انہیں بگاڑا ہے جن کا اس سے بظاہر کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے باوصف یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اس ایک مسئلہ نے ہماری ہر مشکل میں اضافہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی حقائق ہیں کہ ہم کوئی معقول اقتصادی پروگرام مرتب نہ کر سکے' خواندگی کی شرح نہ بڑھا سکے اور دفاع میں خود کفیل ہونے کیلئے کوئی صحیح بنیاد نہ رکھ سکے۔

متارکہ جنگ کے چند ماہ بعد میں نے ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا' "کشمیر کے بعد کیا ہو گا۔" راولپنڈی سازش کیس کی دستاویزات میں' یہ مقالہ موجود ہے۔ اس مقالے میں یہ دکھانا مقصود تھا کہ متارکہ جنگ کے معاہدے میں چونکہ ایسی کوئی بات موجود نہیں' جو ہندوستان کو استصواب کرانے پر مجبور کر دے' لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان استصواب نہیں کرائے گا اور اس دوران میں جس قدر تاخیر ہو گی اور وقت گزرتا جائے گا' اس کا

فائدہ ہمیں نہیں بلکہ ہندوستان کو پہنچے گا۔ اعلیٰ حلقوں میں یہ دلیل پیش کی جاتی تھی کہ ہمیں اپنی فوجی طاقت میں اضافے کے لئے وقت درکار تھا تاکہ ہم بعد میں کشمیر کا مسئلہ طے کرتے لیکن یہ بات نہایت سادہ لوح لوگوں پر بھی ظاہر تھی کہ اس دوران میں ہندوستان بھی اپنی فوجی طاقت میں کئی گنا اضافہ کر چکا ہو گا۔ اس نظریئے کی بنیادی کوتاہی' دراصل یہ خیال تھا کہ کشمیر میں جو بھی کارروائی کی جائے گی' اس کا لازمی نتیجہ جنگ ہو گا۔ اور یہ کہ ہماری طاقت کا تخمینہ صرف مادی اور عددی مقابلے کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے اور اس ضمن میں بہت سے دوسرے اسباب و محرکات کو شامل کرنے کی ضرورت نہیں جو اس وقت موجود تھے اور جو اس طرح کے حالات میں بہرطور موجود ہوتے ہیں۔ وہ مقالہ میں نے وزیراعظم کو بھیج دیا اور بالآخر مجھے طلب کر لیا گیا۔ راولپنڈی میں وزیراعظم کے ساتھ دو گھنٹے تک میری اور ان کی بات چیت ہوتی رہی' اور میں اس احساس کے ساتھ واپس ہوا کہ انہوں نے میرا موقف بالآخر سمجھ لیا ہے اور اس سے انہیں ہمدردی ہے۔

تاہم اس ملاقات کے بعد کئی مہینے گزر گئے اور کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا۔ دریں اثنا جہاں تک ہماری فوجی طاقت کی اصلاح کا معاملہ تھا' اس سلسلے میں بھی' اس نہج پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی حالانکہ ہمارے لئے یہ راستہ صاف کھلا تھا' یعنی عوامی ملیشیا' جیسی فوجی بھرتی' نوجوانوں کے لئے فوجی تربیت کا بندوبست اور دیسی ساخت کے اسلحہ کی تیاری۔ جہاں تک اسلحہ سازی کا تعلق ہے۔ اس کے لئے میں نے قبل ازیں وزیراعظم کو دس لاکھ روپے کی گرانٹ کے لئے آمادہ کر لیا تھا' تاکہ اس رقم سے' شہروں کی مقامی ورکشاپوں میں چھوٹے اسلحہ کی تیاری کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ اس وقت مجھے یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی تھی کہ لوگ دو ہی ہفتوں میں مقامی ساخت کی اسٹین گنیں' حتیٰ کہ ۳۰۳ نمبر کے کارتوس بھی بنا کر لے آئے تھے۔ ان چیزوں کا اسلحہ کے ترقیاتی شعبے میں' جہاں میں نے انہیں بھجوا دیا تھا۔ جب ابتدائی معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کی کامیاب پیداوار کا امکان شک و شبہ سے بالا ہے۔ لیکن چھ ہفتے بعد میری غیرحاضری میں یہ ساری سکیم روک دی گئی اور صاف ظاہر تھا کہ یہ کارروائی' انسپکٹر جنرل پولیس قربان علی خاں کے مشورے پر کی گئی ہے اور ان کا استدلال یہ تھا کہ مقامی نوعیت کی یہ اسلحہ سازی پاکستان میں قانون اور امن عامہ کے لئے خطرناک صورت حال پیدا کر دے گی۔

تقریباً ایک سال بعد' میں نے ایک اور مضمون لکھا جس کا عنوان تھا۔ "عبداللہ کے کشمیر میں کارروائی جاری رہے۔" (راولپنڈی سازش کیس کے ریکارڈ میں یہ دستاویز بھی

موجود ہے۔) اس مقالے میں، میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہم اقوام متحدہ کے مبصرین کی موجودگی میں چونکہ متارکہ جنگ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے، لہٰذا ہمارے لئے صحیح اور نہایت ضروری لائحہ عمل یہ رہ جاتا ہے، کہ مقبوضہ کشمیر کے عوام کو امداد بہم پہنچائیں، تاکہ ہندوستان کے قبضے کے خلاف وہ اپنی داخلی تحریک آزادی کو مضبوط بنائیں اور جدوجہد کو تیزی سے آگے بڑھائیں۔ اس پر بھی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ برسراقتدار افراد اس معاملہ میں اقوام متحدہ سے بار بار کی گزارش سے ہی مطمئن ہیں۔

لیکن یہ بات، غور و فکر کرنے والے لوگوں پر ایک بار پھر واضح ہو گئی تھی کہ صورت حال اگر جوں کی توں رہی تو اقوام متحدہ کچھ بھی نہ کر سکے گی۔ متارکہ جنگ کے معاہدہ میں اقوام متحدہ نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کہ ہندوستان نے اگر استصواب نہیں کرایا تو یہ ادارہ کیا کرے گا۔ لیکن اس سے قطع نظر، اقوام متحدہ کے کرنے کے لئے اب رہ بھی کیا گیا تھا۔ ہندوستان اس سے خوش تھا کہ معاملات کو ان کے حال پر چھوڑ دے کیونکہ جو کچھ وہ چاہتا تھا، اسے پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔ پاکستان کی طرف سے ہندوستان کو کسی طرح کا خطرہ نہ تھا اور اس بنا پر کہ کشمیر میں داخلی طور پر آزادی کی تحریک کی مدد نہیں کی جا رہی تھی۔ امن کے لئے خطرہ کسی جگہ بھی نہیں تھا۔ لہٰذا اقوام متحدہ کی مداخلت کا بھی کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ان امور پر میرے خیالات، اس وقت تک خاصے مشہور ہو چکے تھے۔ اور پھر ان خیالات کو چھپانے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ چنانچہ میرے لئے مناسب کام یہ تھا کہ فوج سے الگ ہو جاؤں۔ دراصل میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار دو بار کیا تھا، لیکن مجھے بتایا گیا کہ جو حالات اس وقت موجود ہیں، ان میں فوج سے علیحدگی پر مجھے غدار کہا جائے گا۔ تاہم دراصل جس چیز نے مجھے فوج سے علیحدگی اختیار کرنے سے باز رکھا، وہ یہ بات تھی کہ میرے لئے فوج سے باہر رہتے ہوئے کشمیر کے مفاد کی خاطر کام کرنے کا امکان اور بھی کم رہ جائے گا۔ قائداعظم پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ وزیراعظم لیاقت علیخاں اس تمام عرصے میں پوری دلچسپی اور ہمدردی سے کام لے رہے تھے۔ لیکن انہیں ایسے مشیروں نے گھیر رکھا تھا جو احتیاط اور توقف کے حق میں دلائل دے رہے تھے۔ کوئی پارلیمنٹ یا حزب اختلاف کی علامتی حکومت حقیقی معنوں میں موجود ہی نہ تھی، جہاں میں اس مسئلہ کو لے جاتا۔ آئین کی عدم موجودگی میں عام انتخابات کا امکان بھی دور تک نظر نہ آتا تھا، جس میں عام لوگ اس طرح کے اختلاف رائے کو پبلک پلیٹ فارم پر لا سکتے ہیں، جیسا کہ جمہوری ملکوں

جب پونچھ ہمارے قبضے سے نکل گیا تھا' جنگ بندی اگر ایک دو مہینے اور منظور نہ کی جاتی تو ہندوستان کی کامیابیوں کے مقابلے میں ہم بھی اپنی کامیابیوں کا توازن پیدا کر لیتے۔ مثال کے طور پر' نوشہرہ سے شمال کی طرف ہندوستان نے جو سلسلہ مواصلات قائم کر لیا تھا۔ ہم اس پر یقیناً شدید ضرب لگاتے اور بے شبہ ہم اس پوزیشن میں تھے۔ کہ پانڈو سے بارہ مولا کی طرف پہاڑیوں پر چند میل اور آسانی کے ساتھ پیش قدمی کرتے اور اس طرح چکوٹی سے بار مولا تک پوری سڑک کو غیر محفوظ بنا دیتے اور ریاست میں بجلی کی سپلائی کا سارا نظام ہماری موجودگی کی بنا پر مستقلاً" خطرے میں رہتا۔

بہرحال اب اس طرح کارروائی کا وقت گزر چکا تھا۔ اور ہم جنگ بندی کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے تھے۔ اب تو یہ تھا کہ ہماری طرف سے انتظار کا عرصہ جتنا طویل ہوتا جاتا' ہندوستان کی طاقت اتنی ہی بڑھتی جاتی' لہٰذا ہمارے لئے اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ مقبوضہ کشمیر کے عوام کی اندرونی طور پر اسلحہ سے مدد کریں۔ انہیں روپیہ فراہم کریں اور ان کے حق میں پراپیگنڈہ کریں' تاکہ مناسب مدت گزرنے کے بعد وہ خود اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی آزادی کی جنگ لڑیں۔

تین ماہ بعد وزیراعظم نے مجھے ملاقات کے لئے طلب فرمایا۔ یہ ملاقات دو گھنٹے جاری رہی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے کچھ اسلحہ کے حصول کا بندوبست کر لیا ہے اور چھ مہینے کے اندر کشمیر کو ہماری امداد پہنچ جائے گی۔ تاہم وزیراعظم کے ساتھ آئندہ ملاقات کے بعد میں ان سے دور اور دور تر ہوتا گیا۔ کشمیر میں میرے کسی نجی مفاد کو خطرہ درپیش نہ تھا۔ لیکن مجھے یہ یقین تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ مسئلہ آسان تر نہیں' بلکہ زیادہ مشکل ہوتا جائے گا۔ اس کے برعکس وزیراعظم کا خیال یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم انتظار سے اپنا مقصد حاصل کر لیں گے۔

اس طرح وہ چھ ماہ کبھی پورے نہیں ہوئے۔ مجھے آخرکار قید ہونا تھا اور ان کی المناک موت' ایک قاتل کے ہاتھوں ہونی تھی اور جنگ بندی کے آئندہ بیس سال بعد تک مقبوضہ علاقے کے عوام کو موجودہ امداد نہ پہنچنی تھی' نہ پہنچی۔

یہاں سوال کیا جا سکتا ہے کہ مقبوضہ علاقے کے عوام کو امداد پہنچانے کا ایک سادہ سا اقدام آخر اب تک کیوں نہیں کیا گیا؟ بالعموم اس سوال کا ایک ہی جواب دیا جاتا ہے' وہ یہ کہ امداد دینے کی صورت میں خطرہ تھا کہ اس سے کہیں ہندوستان اور پاکستان میں جنگ نہ چھڑ جائے۔ چنانچہ حکومت کو برابر یہ مشورہ دیا جاتا رہا کہ ایسا کوئی خطرہ ہرگز مول نہ لیا جائے۔

باب ۱۶

فائر بندی

اکتیس دسمبر ۱۹۴۸ء کو نصف شب جنگ بندی کا باقاعدہ اعلان ہوا جسے دونوں فریقوں نے تسلیم کر لیا۔ یہ اعلان ہمارے لئے غیر متوقع نہ تھا کیونکہ ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ اس مسئلے کا آخری اور حتمی حل جنگ بندی ہی میں مضمر ہے۔ اور جنگ کے ذریعے اس مسئلے کو صرف طول ہی دیا جا سکتا تھا' دوسری طرف کشمیری مسلمان اور آزاد فوج بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی کہ طاقت کے ذریعے بھارت کو اس علاقہ سے نکالنا ان کے بس کی بات نہیں تھی' جنگ کو طول دینے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ بھارت کشمیر میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کروانے کا وعدہ کرے اور اس وعدہ کی ضامن اقوام متحدہ ہو اور اب جبکہ بھارت نے رائے عامہ سے وعدہ کر لیا تو جنگ بندی قبول نہ کرنے کے لئے کوئی جواز نہیں رہ جاتا تھا۔ البتہ اس جنگ بندی سے قبل آزاد حکومت ان کے دستے اور ہم یہ ضرور چاہتے تھے کہ اس جنگ بندی کے نتیجے میں حساس علاقے دشمن کے ہاتھ نہ جانے پائیں اور بھارت کو اپنے وعدے پر قائم رکھنے کے لئے یا اس پر دباؤ ڈالنے کے لئے کچھ ایسے علاقے ہمارے ہاتھ میں رہیں جنہیں ہم ترپ کے پتہ کے طور پر استعمال کر سکیں۔ جبکہ اس فائر بندی کے نتیجے میں بھارت وہ سب کچھ حاصل کر چکا تھا جس کے لئے اس نے کشمیر میں جنگ کا آغاز کیا تھا۔

بھارت کے لئے اب کوئی ایسا علاقہ مقام یا پہاڑی اور پہاڑی سلسلہ نہیں تھا' جس کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت ہو اور جہاں تک کشمیر کے ساتھ ساتھ بہتر طور پر ہوائی رابطہ رکھنے کی ضرورت کا تعلق ہے اس کے لئے اہم مقامات ان کے ہاتھ میں تھے اور کھوئہ بلکہ اس سے بھی آگے تک پختہ سڑک کی تعمیر کا کام تیزی سے جاری تھا' اور اس طرح بھارت کو کشمیر کا مکمل قبضہ میں رکھنا آسان ہو گیا تھا۔ اب ہمارے ہاتھ میں کوئی ایسا علاقہ یا مقام نہ تھا جس میں بھارت کی دلچسپی ہو اور وہ ہمارے قبضے میں ہوتا کہ اگر بھارت رائے شماری میں تاخیر یا انکار کرے تو ہم اس جگہ یا علاقے کو بطور دباؤ استعمال کر سکیں اور جنگ بندی

کے معاہدہ میں اس نوعیت کی کوئی شق یا اشارہ موجود نہ تھا' اس معاہدے میں اس امر کی بھی کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی کہ یہ رائے شماری کتنی مدت کے اندر کروائی جائے گی۔ اقوام متحدہ نے اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے صرف اتنا کیا تھا کہ دونوں ملکوں کو جنگ بندی پر رضامند کر لیا اور فریقین سے ایک متفقہ معاہدہ پر دستخط کروائے مگر اول تو اقوام متحدہ نے کشمیر کے مسئلہ کو اپنی ذمہ داری تسلیم نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس معاہدہ کی پابندی کے لئے وہ بھارت کو مجبور کرنے کے لئے کسی قسم کے اختیارات کا استعمال کر سکتی تھی اور اگر بھارت اس معاہدہ سے روگردانی کرے تو اقوام متحدہ سزا کے طور پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کرنے کی پابند بھی نہ تھی۔ اب لے دے کر یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ ہم بھارت کی جانب سے نیک خواہشات کے ساتھ اس معاہدہ پر پابندی کا انتظار کریں' چونکہ اس امر کا ہمیں یقین تھا کہ کشمیری عوام رائے شماری میں پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کریں گے۔ لٰہذا بھارت ہمیں کشمیر کسی پلیٹ میں سجا کر پیش کر دے گا اور بھارت نے جتنی بڑی جنگی تیاریوں اور شدید جنگ کے بعد اس کشمیر پر جس طرح قبضہ کیا تھا اس کی روشنی میں بھارت کی جانب سے عمل کی توقع عبث تھی۔

بھارت کی جانب سے کسی بہتر جذبے کا اظہار اسی صورت میں ممکن تھا جب دونوں ملکوں کے مابین کچھ لو اور کچھ دو کے خیرسگالی تعلقات استوار ہو جاتے۔ مگر یہاں تو عالم یہ تھا کہ بھارت جو کچھ لینا چاہتا تھا وہ پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔ اب اگر پھر بھی بھارت کسی بھی صورت میں کشمیر کو پاکستان کے حوالے کرتا ہے تو یا تو ہماری غیر معمولی خوش قسمتی ہو گی یا پھر بھارت کی طرف سے غیر معمولی فیاضی کا مظاہرہ۔

کچھ عرصہ بعد میں نے وزیراعظم سے ملاقات کے دوران اس صورتحال سے متعلق اپنے تمام شکوک و شبہات کا اظہار کیا جن سے ہم دوچار تھے' میں نے ان سے پوچھا کہ کیا انہوں نے اس معاہدہ پر دستخط کرنے سے قبل کسی ایسے شخص یا مجھ سے اس پوری صورتحال پر تبادلہ خیال کیا اور میں بلاشبہ اتنی اہمیت کا حامل نہ تھا کہ وزیراعظم مجھ سے اس قسم کا مشورہ کرنے کے پابند ہوتے' کیونکہ انہیں مشورہ دینے کے لئے مجھ سے بڑے افسر موجود تھے مگر میں یہ سوال اس اعتبار سے کر رہا تھا کہ اول تو اس پوری جنگ میں ابتدا ہی سے شریک رہا ہوں' دوم اس علاقے کی جغرافیائی صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے بہتر مشورہ دے سکتا تھا۔

ہم سب جانتے تھے کہ جنگ بندی ناگزیر ہے مگر یا تو یہ جنگ بندی ایک ماہ قبل نافذ

العمل ہو جاتی یا پھر مزید کچھ عرصہ کے لئے التوا میں چلی جاتی' کیوں کہ پہلی صورت میں پونچھ بدستور ہمارے گھیرے میں رہتا اور دوسری صورت میں ہم بھارتی فوجوں کو اس قدر سخت سزا دیتے کہ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔ ہم بھارتی فوجوں کو جموں' نوشہرہ کے درمیان کاٹ ڈالتے بلکہ چکوٹی سے آگے بارہ مولا تک اس سارے علاقے کو اپنے قبضے میں لے لیتے اور اس طرح کشمیر کے ساتھ بھارت کے مواصلاتی رابطہ اور بجلی کی فراہمی پر بھی ہماری دسترس ہوتی۔

اب تمام باتوں کا وقت گزر چکا تھا اور اب ہمیں جنگ بندی کو قبول کرتے ہوئے تلخ حقائق کو تسلیم کر لینا چاہئے تو اس کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہئے مگر اس صورت میں جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا' بھارت کے قدم کشمیر میں مستحکم ہوتے جائیں گے جس کا موجودہ حالات میں ایک ہی حل ہے کہ ہم کشمیر میں مسلم آبادی کو ہر قسم کی امداد فراہم کرتے رہیں۔ اسلحہ' ہتھیار' رقومات کے ساتھ ساتھ ان کی جدوجہد کے سلسلے میں موثر تشہیر تاکہ کشمیری مسلمان اپنی جنگ آزادی کو برقرار رکھیں اور کسی بھی لمحہ یہ نہ محسوس کریں کہ وہ تنہا ہیں' اور اس طرح وہ اپنی جدوجہد اور ہمارے تعاون سے کشمیر میں بھارت کے قبضے میں رہتے ہوئے بھی بالاخر اس مقصد کو حاصل کر لیں گے جو دوسرے ذرائع سے حاصل کرنے میں ہم ناکام رہے اور ہمارا یہ عمل فوری ہونا چاہئے۔

تین ماہ بعد وزیراعظم نے مجھے بلایا اور ہماری یہ ملاقات دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اس ملاقات کے دوران وزیراعظم نے مجھے مطلع کیا کہ انہوں نے میری تجویز کے مطابق کچھ ہتھیار حاصل کرنے کا اہتمام کر لیا ہے۔ باقاعدہ کارروائی جلد شروع کر دی جائے گی مگر اس چھ ماہ کے عرصے میں میں جتنی مرتبہ بھی وزیراعظم سے ملا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے اور ان کے مابین سوچنے کے انداز میں بہت تبدیلی واقع ہو رہی ہے' اور میں ان سے دور ہوتا جا رہا ہوں کیونکہ میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے۔ حالات مزید سنگین ہوتے جا رہے ہیں' حالانکہ یہ میرا ذاتی مسئلہ نہیں تھا مگر میں اس نقصان کو دوسری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جس قدر تاخیر ہو رہی ہے' وہ ہمارے حق میں ہے۔

چھ ماہ کا عرصہ کبھی ختم نہ ہو سکا' مقبوضہ کشمیر کے عوام کی مدد کا معمولی کام بھی کبھی نہ ہو سکا۔

علاقوں اور دوسرے مقامات پر قبائلیوں کو کشمیر میں ہماری حمایت کیلئے تیار رکھنے پر صرف کی جاتی تھی' اگر یہ ہند سے ۱۲ کروڑ روپے سالانہ ہی رہے تھے تو اب تک ہم ۳۰۰ کروڑ روپے کے لگ بھگ رقم اس کام پر صرف کر چکے ہیں' یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس کے مقابلہ میں اگر ہم نے مقبوضہ کشمیر میں اندرونی بغاوت کیلئے ایک کروڑ روپے بھی صرف کئے ہوتے تو کئی سال پہلے یہ مسئلہ حل ہو چکا ہوتا۔

مزید براں دس کروڑ روپے کی لاگت سے پورے پاکستان میں پرائمری سکول بنائے جا سکتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ شاید پانچ کروڑ روپے سے قومی رضاکارانہ مہم کے تحت اپنی تعطیلات کے دوران کچھ عرصہ کیلئے کام کرنے والے تقریباً ۵۰،۰۰۰ طلبا اور اساتذہ کی مدد سے اب تک ہم پورے ملک کو خواندہ بنا چکے ہوتے' ایک اور کروڑ روپے سے اندرون ملک بننے والے پستولوں' رائفلوں' شاٹ اور سٹین گنوں اور دستی بموں حتیٰ کہ بڑی توپوں کی تیاری کا کام شروع کیا جا سکتا تھا' اگر چار صدیاں پہلے اسی ملک میں بابر کے زمانہ میں یہ کام ہو سکتا تھا تو اب کیوں نہیں ہو سکتا۔ بنیادی فولاد اور مشین انڈسٹری کا تو ذکر ہی کیا' اگر باقیماندہ ۳۰۰ کروڑ روپے بھاری صنعتوں پر خرچ نہ ہوتے تو ہمارے نوجوانوں کو چھ ماہ تک خوراک' کپڑوں اور تنخواہ کے ساتھ فوجی تربیت کیلئے یہ رقم کافی ہوتی اور ان کی تعداد اب تک پچاس لاکھ ہو چکی ہوتی' اگر کسی کے تصور میں نہ آتا ہو کہ پچاس لاکھ نظر کیسے آتے ہوں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوں تو وہ ۱۴۰۰ میل پر پھیلے ہوں گے' دوسرے لفظوں میں' پاکستان کے اندر سمندر سے لاہور تک' کشمیر سے گلگت تک۔

۵۰ لاکھ تربیت یافتہ افراد چاہے وہ دیسی ساخت کے اسلحہ سے ہی لیس ہوتے پاکستان کیلئے آج حد درجہ مفید تھے' یا پھر وہ سنہری کشکول جسے ہم نے دوسروں کے آگے مسلسل پھیلایا ہوا ہے؟

کشمیر کی آزادی کیلئے صحیح سمت میں ایک قدم نہ اٹھا کر ہمارے لیڈر خوف تلے دبے رہے ہیں' خوف کے باعث انہوں نے ہماری انمول آزادی کو دولت' آسائشیں اور اسلحہ حاصل کرنے کیلئے بیچ دیا' اس کے نتیجہ میں انہوں نے اتنے قرضے حاصل کئے کہ انہیں واپس کرنا ہمارے بس میں نہیں رہا۔ اس طرح ملک میں بے رحمی کے ساتھ استحصال کرنے والے صنعتی لٹیرے پیدا ہو گئے' اس کے نتیجہ میں پاکستان اور بھارت کے مابین معمول کی تجارت اور آمدورفت بند ہو گئی۔ جس سے دونوں اطراف کے عام لوگوں کو نقصان پہنچا'

اس صورت حال کے باعث ہماری قومی زندگی کے تار و پود میں غیر ملکی ایجنٹ در آئے اور مداخلت کرنے لگے، ہر فیصلہ، ہر حکومت کی تبدیلی، ہر سیاسی، اقتصادی اور سماجی معاملہ غیر ملکی سازشوں کا مرہون منت ہو کر رہ گیا۔

کبھی کبھی عوام کے شکوک کا ازالہ کرنے کی غرض سے برسراقتدار آنے والا ہر لیڈر یہی اعلان کرتا رہا کہ ہمارے قرضے، ہمارے معاہدے اور ہمارے بھاری فوجی اخراجات کشمیر کی آزادی اور بھارتی جارحیت کے دفاع کیلئے ہیں، یہ سب کچھ غیر ملکی طاقتوں کے اس واضح اور برملا اعلان کے باوجود تواتر کے ساتھ کہا جاتا رہا کہ ان معاہدوں اور ہتھیاروں کو بھارت کے خلاف استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔ یہ سب کچھ محض اس لئے ہوا کہ ہم نے کشمیر کے معاملہ میں اپنی ذمہ داری کو جرات کے ساتھ نہیں نبھایا، وہ لوگ آزاد نہیں ہوتے جو اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے خطرات کا پامردی کے ساتھ سامنا نہیں کرتے۔ شروع سے ہی ہمارے لیڈروں پر خوف کا غلبہ رہا ہے۔

قائداعظمؒ کی اپنی مثال فراموش کر دی گئی۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شب، اپنی زندگی کا مقصد حاصل کر لینے کے تین ماہ بعد انہوں نے پاکستان کے وجود کا خطرہ مول لے کر جموں پر حملے کا حکم دینے کی جرات کا مظاہرہ کیا، ان کی ذات میں اہم فیصلے کرنے کا جوہر موجود تھا، وہ واحد شخص تھے جن میں ایک آزاد قوم کیلئے قائدانہ صلاحیت تھی، ان کے بعد شکوک و شبہات در آئے، لیاقت علی خان کی موت سے تو اتحاد کا باب بھی ختم ہو گیا۔

غلط فیصلے جزوی یا کلی طور پر حقیقی یا مصنوعی ڈر سے جنم لیتے ہیں، یہ بھارت کا ڈر تھا جس نے ہمیں غیر ملکی آقاؤں کا تابعدار بنا دیا۔ یہ ہمارے عوام کا ڈر تھا جس نے ابتدائی طور پر ہمیں مقامی طور پر اسلحہ سازی اور نوجوانوں کو عسکری تربیت دینے سے روکے رکھا، شاید ہم تعلیم بالغاں سے بھی ڈرتے ہیں، یہ جمہوری تبدیلی اور اقتدار سے محرومی کا ڈر تھا کہ ۴۸-۱۹۴۷ء کی جنگ کشمیر میں ہمارے ایک لیڈر کو بھی کشمیر میں داخل ہونے اور محاذ کی صورتحال کا جائزہ لینے کا حوصلہ نہ ہوا، ہماری جانب سے کسی نے سرحد عبور نہ کی، ایک وزیر نے بھی نہیں، کسی سیکرٹری نے بھی نہیں، حد یہ ہے کہ وزیراعظم کے سب سے بااعتماد مشیر نے بھی ایک نظر ڈالنے کیلئے ادھر کا رخ نہ کیا۔

بھارت کی سرحد پر چین کے دباؤ کے بعد بھارت نے اپنی غیر جانبداری ختم کر کے جنگ بازی کی راہ اختیار کی تھی، مگر ہماری جانب ایوب خان نے پاکستان پر یحیٰی خان کو مسلط کر کے صورتحال مزید پیچیدہ بنا دی، ہماری تاریخ میں یحیٰی خان کے کردار کی کچھ زیادہ وضاحت

کی ضرورت نہیں ہے۔

' اس نے اپنے غم پیالے میں ڈبو دیئے اور ایک گانے کے عوض اپنی عزت بیچ دی'
ایوب اور یحیٰ فوجی شعبہ میں تخلیق کار تھے' اگر ایوب خان میدان جنگ میں کبھی اترے بغیر دنیا کو پہلا فیلڈ مارشل دے سکتا ہے' تو یحیٰ بھی بھارت کو دوسرا فیلڈ مارشل دے سکتا تھا۔

اس برصغیر میں فیلڈ مارشل ہونے کا اعزاز میدان جنگ میں حاصل نہیں ہوتا جیسا کہ اس باب کی ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے' کشمیری عوام کو اپنی تحریک آزادی خود چلانی چاہئے تھی' مگر کئی پاکستانیوں کو جو سوال پریشان کرتا' یہ ہے کہ آیا اس طرح ہم پر جنگ مسلط نہ ہو جائے گی اور کیا ہم ایسی کسی جنگ کا سامنا کر سکتے ہیں' اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جارحیت کا ارتکاب کرنے سے بچ سکتے ہیں مگر دنیا میں دوسرے لوگوں کی طرح ہم جنگ سے بچ نہیں سکتے' یہ کشمیر کے باعث نہیں بلکہ یہ خود ہمارے وجود کی وجہ سے ہے' چاہے ہم گردن اٹھا کر چلیں جو مردوں کا شیوہ ہے یا ہم بچوں کی طرح کسی بڑی طاقت کے دامن میں پناہ ڈھونڈیں' جنگ ہم پر مسلط ہونی ہی ہے۔

اس صدی کے جنگی امور پر لکھنے والے سب سے معروف جنرل فلر کا کہنا ہے۔

"آیا بنی نوع انسان کے ارتقا میں جنگ ضروری ہے' اس پر بحث ہو سکتی ہے' لیکن ایک حقیقت جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا' یہ ہے کہ انسان کے اولین زمانوں سے لے کر اب تک انسانی تاریخ کا کوئی دور جنگ سے خالی نہیں رہا اور شاید ہی کوئی نسل کسی بڑے جنگی تصادم کا مشاہدہ نہیں کرتی' بڑی جنگیں لہروں کے سے تسلسل کی طرح جاری رہتی ہیں"

آج ہم جنگ کی سی حالت میں رہ رہے ہیں' اس حالت میں تمام انسانی افعال جنگ کے تابع ہیں اس لئے اگر ہم دوسرے شعبوں کو نظم و ضبط کے ساتھ چلانا چاہتے ہیں' تو ہمیں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جنگ کیا ہے۔

پیچھے مڑ کر ۱۹۴۷ء سے اب تک ہونے والے تین تصادموں کا جائزہ لیتے ہوئے اگر ہم ان کے طریق کار سے مطمئن ہیں تو پھر ہمارے لئے سیکھنے والا کوئی سبق باقی نہیں اور اگر ہم مطمئن نہیں ہیں' تو پھر ہم یہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان جنگوں سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہوئے جن کے حصول کیلئے یہ جنگیں لڑی گئی تھیں' جس مقام پر صحیح کارروائی کر کے ہم اپنے مقاصد حاصل کرنے کے قریب پہنچ سکتے تھے وہ مواقع ہم نے گنوا دیئے۔

فوجی کارروائیوں کیلئے ایسے مقاصد چنے گئے' جو اگر حاصل بھی ہو جاتے تو کوئی فائدہ

نہیں ہونا تھا' فوجی اخراجات نہ صرف ہماری آمدنی سے بے حد و حساب باہر تھے' بلکہ ان کا کوئی جواز بھی نہیں تھا' قومی طاقت کے وسیع و عریض سکیٹریا تو کام میں لائے ہی نہ گئے بلکہ آدھا ملک بھی ہاتھ سے گنوا دیا اور کشمیر ابھی تک غلامی میں جکڑا ہوا ہے۔ ابھی تک ایسے کوئی آثار نہیں کہ استحکام پیدا ہو گیا ہے یا تحفظ کا احساس جاگزیں ہوا ہے' اس کی وجہ جنگ میں ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی بلکہ اس طریق کار میں ملے گی جو جنگ کے دوران اختیار کیا گیا اور جو جنگ کے فن سے مکمل لاعلمی کا سراغ دیتا ہے۔

جنگ کا فن یقینی طور پر ہمسایہ کے ساتھ اسلحہ کی دوڑ شروع کرنے میں نہیں اور نہ ہی اس میں ہے کہ ہتھیاروں' صنعت اور افرادی قوت میں برابری یا برتری حاصل کی جائے' اگر ایسا ہوتا تو جنگ کا عمل دونوں جانب کے میجروں کے موازنہ تک ہی محدود ہو جاتا اور اس کو دیکھ کر کوئی فاتح ہوتا اور کوئی شکست یافتہ' مگر ایسا نہیں ہے' شاید ہی کبھی چھوٹے ملکوں کو اپنے سے بہت بڑی طاقت کے ساتھ نبرد آزما ہونا پڑتا ہے' کیونکہ ایسا ضروری ہو جاتا ہے۔

جنگ کیلئے تیاری اور اس تیاری کے طریق کار میں فرق ضرور ہونا چاہیے' کیونکہ اس کا بجٹ سے تعلق ہوتا ہے اور جس کا اکثر یہ مطلب ہوتا ہے کہ بہترین اسلحہ سے لیس تعداد میں چھوٹی فوج ہو' اس سے بڑی تربیت یافتہ ریزرو فوج ہو' زندگی کے تمام طور طریقوں میں پوری قوم کی حمایت حاصل کرنے اور اس کے استعمال کے منصوبے ہوں' اور کسی خصوصی فوجی کارروائی میں مہارت ہو جیسا کہ ہمارے معاملہ میں بڑی تعداد میں مسلح قبائلی ہیں جو اپنے علاقہ میں دفاع کیلئے مہارت رکھتے ہیں اور باہر نکل کر بھارت کے خلاف طویل فاصلہ کی چھاپہ مار کارروائیوں کیلئے شہرت یافتہ ہیں۔

طریق جنگ صورتحال کو جوں کا توں لینے اور اس سے نبرد آزما ہونے کیلئے بہترین ممکنہ اقدام اختیار کرنے کا نام ہے اس طرح کام کرنا تبھی آ سکتا ہے' جب جنگ کی سمجھ ہو اور تاریخ کا مفصل مطالعہ بھی'

عام طور پر جنگوں کو دو زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے' محدود سیاسی مقاصد اور غیرمحدود سیاسی مقاصد والی جنگیں' جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے یا دوسری قوموں کا بھی' ہمارا واسطہ پہلے زمرہ یعنی محدود سیاسی مقاصد والی جنگوں سے ہے۔

یقینی طور پر ایٹمی ہتھیاروں کے وجود میں آنے کے بعد جنگ کا تعلق پہلے زمرہ سے ہی رہ گیا ہے۔ ۱۹۵۴ء کا ہائیڈروجن بم ۱۹۴۵ء کے پہلے ایٹم بم سے ہزار گنا زیادہ دھماکہ خیز

کا دستور ہے۔

دسمبر ۱۹۵۰ء میں مجھے ترقی دے کر میجر جنرل بنا دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں چیف آف دی جنرل سٹاف مقرر کیا گیا۔ جنرل ایوب خاں اس وقت ڈپٹی کمانڈر انچیف تھے۔ اور چند ہفتوں کے بعد کمانڈر انچیف کے طور پر ان کا تقرر ہونے والا تھا۔ میں نے یہ بات پوری صفائی کے ساتھ ان کے گوش گزار کر دی کہ کشمیر کے سوال پر حکومت سے میرے اختلاف آرا کی بنا پر، جو کہ سب کو معلوم نہیں۔ نہ تو میری ترقی مناسب ہے اور نہ چیف آف جنرل سٹاف کے طور پر میرا تقرر قرین مصلحت۔ جنرل ایوب خاں نے جواب دیا کہ میں نے حکومت سے آپ کو خود ہی مانگا ہے، اس لئے یہ تقرر آپ کو منظور کر لینا چاہئے۔ اب میرے لئے بظاہر کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اگرچہ دو نکات کے بارے میں مجھے کامل یقین تھا۔ اول یہ کہ ہر ایک مہینہ جو گزرتا تھا۔ تو اس کے معنی یہ ہوتے تھے۔ کہ کشمیر کے تابوت میں ایک کیل اور ٹھونکی گئی۔ اور دوسرے یہ کہ نہ تو جنرل ایوب خاں کا اور نہ حکومت کا کوئی ارادہ اس صورت حال کو روکنے کا تھا۔

کشمیر کا مسئلہ دور از کار ہو کر پہلے ہی اہمیت کھوتا جا رہا تھا۔ اور جنرل ایوب خان اب اکثر و بیشتر روس اور چین کے خطرے کی بات کرنے لگے تھے۔ جسے وہ شکنجے کی کارروائی کا نام دیتے تھے جو پاکستان کو اپنی گرفت میں لے کر اتنی زور سے دبائیں گے کہ یہ ملک اخروٹ کی طرح تڑ سے ٹوٹ جائے گا۔ یہ بات کس نے اور کیونکر ان کے دماغ میں ڈالی۔ اس وقت مجھے اس کا علم نہ تھا۔ تاہم جیسا کہ ظاہر ہے عقل اس اندیشے کو باور نہیں کرتی تھی۔

خطرے کا ایک زیادہ قرین فہم امکان روس کی توسیع پسندی کی صورت میں موجود تھا لیکن اس کا رخ ایران کی طرف تھا کیونکہ روس بحیرۂ ہند میں داخل ہونے کے لئے بصرہ جیسی ایک بندرگاہ کی ضرورت ایک طویل عرصے سے محسوس کرتا آیا ہے، تاکہ مغربی طاقتوں کو ایرانی تیل کے وسیع ذخائر سے محروم کر دے۔ لیکن نقشہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ اس طرح کی توسیع روس کے ساتھ ایران کی مشترکہ سرحد پر ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں افغانستان کی طرح مغربی پاکستان بھی دور دور تک روس کے راستے میں نہیں آتا۔ اسی طرح مشرق میں چین کی توسیع فطری طور پر جنوب مشرق کی جانب تھائی لینڈ اور غالباً برما کے راستے سے ہو گی اور یہاں بھی مشرقی پاکستان، چین کے راستے میں نہیں آتا۔ درحقیقت ان دنوں ہو یہ رہا تھا کہ مغربی طاقتیں سویت روس اور چین کے گرد فوجی اڈے چاہتی

تھیں۔ مغرب میں اس قسم کے اڈے برطانیہ' یا مشرقی یورپ میں ہوتے' مشرق بعید میں جاپان' فارموسا اور فلپائن یہ کام کر سکتے تھے مگر وسط میں ابھی کوئی علاقہ نہیں ڈھونڈا جا سکا تھا۔ ترکی اور ایران کی سرحدیں بھی اس کے ساتھ ملحق تھیں اور یہ محفوظ نہیں سمجھے جا سکتے تھے شاید افغانستان اس پر رضامند نہ تھا یا وہ محفوظ نہ تھا۔ مصر (اس وقت شاہ فاروق حکمران تھے) بہت دور تھا' اب پاکستان و بھارت کا برصغیر ہی تھا جہاں رینج اور سیکورٹی ممکن تھی۔ بھارت نے مغرب مشرق کی طاقت آزمائی میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا اور پاکستان میں عام لوگوں کا خیال تھا کہ غیر ملکی طاقتوں کے ساتھ کوئی کمٹ منٹ نہیں ہو گی۔ یہاں اس کی راہ ہموار ہو رہی تھی میں ان مذاکرات میں شریک نہیں ہوا مگر اس سلسلہ میں مباحثہ پھیلتا ہوا نچلی سطح تک بھی پہنچ گیا تھا۔ میں نے بریگیڈیئر حبیب اللہ (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) سے سنا ----- "پاکستان خوبصورت عورت کی طرح ہے جو سب سے زیادہ بولی دینے والے کے ہاتھ بکنی چاہئے"۔

اور بالآخر امریکہ کے ساتھ ہمارے تعلقات اس سے کچھ مختلف نہ تھے ایک وجہ جو سمجھ میں آتی تھی' یہ تھی کہ ہمیں کشمیر کو آزاد کرانے اور بھارت کے مقابلہ میں دفاع کے لئے طاقت ور ہونا ضروری تھا مگر بارہ سال تک قرضے' گرانٹیں اور اسلحہ و گولہ بارود کے انبار حاصل کرنے کے بعد ایوب خان اس قابل نہ تھا کہ ۱۹۶۵ء میں سترہ روز سے زیادہ جنگ لڑ سکتا۔

۱۹۵۶ء میں جیل میں اپنی رہائی کے چند ماہ بعد میں نے ۳۰ صفحات کا ایک پمفلٹ لکھا جس کا عنوان تھا۔

'کشمیر کا مسئلہ کیسے حل ہوتا'

اس کی پانچ ہزار جلدیں شائع ہوئیں یہ بھارتی پارلیمنٹ میں زور دار بحث کا سبب بن گیا اور بھارتی اخبار میں شہ سرخیوں کے ساتھ اس کا ذکر ہوا اس کا لب لباب یہ تھا کہ اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل سے اپلیں کرنے سے کچھ نہ ہو گا کیونکہ اس معاملہ میں سلامتی کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہمیں مقبوضہ کشمیر کے عوام کی ان کی آزادی کے لئے مدد کرنی چاہئے اور اگر ان کی مدد کرنے پر بھارتی حکومت پاکستان پر مداخلت کا الزام لگاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ عالمی امن کو خطرہ ہے اور تب ہی اقوام متحدہ کے لئے معاملہ میں مداخلت کرنے کا جواز پیدا ہو گا' اگر بھارت مداخلت کرے تو دنیا اس کے خلاف کارروائی پر مجبور ہو گی اور کسی صورت میں بھی بھارت کی پوری فوج آدھے مغربی پاکستان کو بھی نیچا

نہیں دکھا سکتی۔

صدر اسکندر مرزا کو کچھ دلچسپی تھی۔ انہوں نے دریافت کیا کہ ہمیں اندرونی کارروائی کے ذیل میں کیا کرنا ہے' وہ یہ جان کر حیران ہو گیا جب میں نے وضاحت کی کہ ایک وقت میں پانچ سو افراد کشمیر میں چھاپہ مار کارروائیوں کیلئے مثالی حیثیت کے حامل ہوں گے' وہ کشمیر کے اندر تخریبی کارروائیاں کریں گے۔ وہ جس سڑک سے ہو کر گزریں گے' بجلی کے تاروں' ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کے تاروں کو محفوظ رکھنا مشکل ہو جائے گا' میرا زور اس پر تھا کہ کم سے کم لوگوں سے کام لیا جائے اور ایک پورے میل کے علاقے میں چند ہی افراد سے کارروائی کروائی جائے' اس طرح ان کا سراغ لگانا ناممکن ہو گا اور ان کیلئے خط متارکہ جنگ کے اس پار جانا مشکل نہیں ہو گا جو کئی مقامات پر کھلی ہے یہ لوگ پوری طرح سے مقامی ہونے چاہئیں' ان کا لباس بھی مقامی لوگوں کی طرح سے ہو اور ان کے پاس پل اڑانے کیلئے ڈائنا مائٹ اور تار کاٹنے کیلئے پلاٹر ہونے چاہئیں' اپنی حفاظت کیلئے ہر ایک کے پاس چاقو اور مقامی طور پر بنا ہوا چھوٹا پستول ہونا چاہئے' انہیں فوج یا پولیس کے خلاف لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں' ان کے ہدف ایسے پل ہونے چاہئیں جہاں محافظ نہ ہو اور الگ تھلگ مقامات پر بجلی و ٹیلی فون کے تار اور ٹرانسپورٹ' اب ایسے حالات نہیں ہیں مگر اسی قسم کے اقدامات سے صورتحال کو تبدیل کیا جا سکتا ہے اور کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

ان پانچ سو چھاپہ ماروں کی جگہ لینے کیلئے مزید پانچ سو چھاپہ مار ہونے چاہئیں' مزید پانچ سو کو زیر تربیت رکھنا چاہئے۔ ان کی تکنیک میں صبر' طویل عرصہ پر پھیلی ہوئی کارروائی اور رازداری شامل ہونی چاہئے۔ ان کی کارروائی کے لئے ۱۲ سے ۱۸ ماہ درکار ہوں گے۔ جب صدر نے دریافت کیا کہ رقم کہاں سے آئے گی تو میں نے پی آئی ڈی سی کے چیئرمین کا حوالہ دیا۔ جس نے فوری طور پر فون کے ذریعے تصدیق کی' بعض لوگ سکیم کیلئے رقوم دینے کیلئے تیار ہیں' پورے منصوبہ کو چلانے کیلئے میں نے تجویز کیا کہ یہ فوج کے ماتحت ہونا چاہئے۔

صدر نے ایک اور سوال دریافت کیا جو یہ تھا کہ اگر بھارت نے جارحیت کی تو لاہور کو بھارتی ٹینکوں سے کیسے بچایا جائے گا۔ میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ چونکہ لاہور میدانی علاقہ کے وسط میں ہے اس لئے شہر کا دفاع شہر کے حصار سے ہونا چاہئے اور اس مقصد کیلئے شہر کے گرد ایک بڑا اور منضبط نظام بنانا ہو گا اور گہری خندقیں بنانی ہوں گی۔ ۵۴ ٹینکوں کی ایک ٹینک رجمنٹ کی قیمت پر ہم طیارہ شکن توپوں کی پانچ رجمنٹیں لیں گے' ہر

رجمنٹ کے پاس ساٹھ سے پینسٹھ ٹینک شکن توپیں ہوں گی۔ یہ توپیں جو طیارہ شکن بھی ہوں گی، لاہور شہر کی ضرورت ہیں۔ مزید براں اس علاقہ میں ہمیں ایک باقاعدہ بریگیڈ سے زیادہ کی ضرورت نہ ہو گی۔ سول ملیشیا اور قبائلی اس کی مدد کریں گے، ہماری فوج جو کچھ بچا سکے، اس سے کام لیا جائے، لاہور سے کافی دور یہ گشتی حملہ آور فورس ہو گی۔

تین ماہ بعد میں صدر سے اگلی بار ملا، انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے جرمنی کی معروف ٹینک کور کے جنرل گڈریاں سے بات کی تھی اور انہوں نے بھی یہی بتایا تھا کہ لاہور کا دفاع شہر کے گرد گہری خندقوں اور طیارہ شکن توپوں میں مضمر ہے، صدر نے کہا کہ وہ لاہور کے دفاع کے معاملہ میں مطمئن ہو گئے ہیں، اس لئے اب انہوں نے جنرل ایوب خان سے کہا ہے کہ وہ کشمیر کی سکیم پر عمل کریں، تاہم ایوب خان نے کہا ہے کہ انہیں کچھ وقت درکار ہے تاکہ وہ اٹلی جا کر وہاں سے اسلحہ لا سکیں، اٹلی سے وہ کس قسم کے ہتھیار حاصل کرنا چاہتا تھا، مجھے اس کا علم نہیں ہے، نہ ہی میں یہ جانتا ہوں کہ یہ کام کبھی شروع ہو گا بھی یا نہیں، تاہم یہ ضرور ہوا کہ ان دنوں مقبوضہ کشمیر میں چند چھوٹے دھماکے ہوئے اور انہیں میرے پمفلٹ کے ساتھ ملا کر بھارت نے مجھ پر الزام لگایا کہ یہ سب میں کروا رہا ہوں۔

نئے وزیراعظم ملک فیروز خان نون نے صرف ایک بار مجھے ایک طرف لیجا کر سرگوشی میں کہا تھا:

'اکبر! تم یہ جان کر خوش ہو گے کہ ہم نے وہ شروع کر دیا ہے'

میں بالکل یہ نہ جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، تاہم میں نے اندازہ لگایا کہ انہوں نے کشمیر کے حوالہ سے یہ بات کی، انہوں نے مزید کہا کہ انہوں نے ڈی آئی جی، سی آئی ڈی میاں انور علی کو کام دے دیا ہے، تب سے مجھے اکثر حیرت ہوتی ہے کہ ملک صاحب کا مطلب کیا تھا، اگر واقعی انہوں نے کشمیر کا حوالہ دیا تھا اور اس مقصد کیلئے انہوں نے انور علی کا انتخاب کیا تھا تو اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ سارے معاملہ کو کس درجہ معمولی اہمیت کے قابل سمجھا گیا تھا۔

کشمیر کے لاینحل مسئلہ کے باعث ہمیں اپنی قومی آمدنی کے بڑے حصہ کو دفاع کی ضرورتوں کیلئے وقف کرنا پڑتا ہے، مگر فوجی اخراجات سے بالکل الگ، میرا خیال ہے کہ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء میں ہمیں تقریباً بارہ کروڑ روپے سالانہ آزاد کشمیر حکومت کے بجٹ کا خسارہ دور کرنے میں صرف کرنے پڑے۔ اس رقم میں وہ الاؤنس بھی شامل ہیں جو قبائلی

طاقت کا حامل تھا' اس لئے ہائیڈروجن بم نے سب سے بڑھ کر مکمل جنگ کے تصور کو بے معنی بنا دیا ہے۔ رائل ایئر فورس کے مارشل سر جان سلیسر کا کہنا ہے "۔ پچھلے چالیس برسوں سے ہم جس مکمل جنگ کے بارے میں جانتے آئے ہیں' اب ماضی کا قصہ بن چکی ہے" رائل ایئر فورس کے مارشل لارڈ ٹیڈر نے اسی نکتہ پر یہ کہتے ہوئے زور دیا ہے۔ 'ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کا مقابلہ کوئی باہمی آویزش نہ ہو گی' بلکہ باہمی خودکشی ہو گی'

۵۵-۱۹۵۴ء کے ان بیانات کے بعد ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کے اثرات پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں جب روسیوں نے چین کے خلاف ایٹمی جنگ کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں' انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ چین کی مزاحمت اور کنٹرول کے مراکز کو مفلوج بنا کر اور اس کی ایٹمی استعداد تباہ کر کے دو ہفتوں کے اندر اندر اسے تباہ کر دیں گے۔ چین نے ایٹمی جنگ کے امکان کو درست جانا اور اپنے دفاع کی تیاریاں شروع کر دیں۔ دنیا نے پہلے تو ان دو عظیم طاقتوں کے تصادم سے کوئی واسطہ تعلق نہ جتایا' مگر ۱۹۶۹ء میں امریکی سائنسدانوں کو پتہ چلا کہ ایسی صورت میں پچاس فیصد سے زیادہ تابکاری اثرات امریکہ پر ہوتے لہٰذا گیس اور کیمیاوی ہتھیاروں کی جنگ کے معاملہ میں' جس کیلئے دونوں فریقوں نے عالمی جنگ کے دوران مکمل تیاری کر رکھی تھی مگر ان ہتھیاروں کا استعمال نہیں کیا تھا' اب ایٹمی جنگ پر بھی کسی کا کنٹرول نہیں تھا۔

اسی دوران میں چین کی دفاعی پالیسی اور تیاریاں ہمارے لئے دلچسپی کا باعث ہیں' چیئرمین ماؤ نے زیرزمین پناہ گاہیں تعمیر کرنے کے احکامات دیئے اور ۱۹۷۱ء تک انہیں مکمل کر لیا گیا' شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح کا ایک ایسا نظام بھی بروئے کار لایا گیا جس کے تحت ہر چھوٹے ریجن کو رسد اور دفاع میں خودکفیل بنا دیا گیا' چیئرمین ماؤ کے حکم میں کہا گیا تھا۔

' مکمل تیاریاں کرو۔ عوامی جنگ لازمی طور پر کئی مشکلات کا سامنا کرے گی' مگر آخری فتح اسی کی ہو گی'

چھاپہ مار کارروائیوں سے ریگولر فوجوں کو شکست دی جا سکتی ہے' ہم انہیں بہت نزدیک آنے دیتے ہیں' کیونکہ اسی صورت میں دشمن کے خلاف عوام کی مختلف طریقوں سے لڑائی شروع ہو گی' ہم انہیں ایک ایک کر کے تباہ کریں گے۔"

چینی فوج اور سول ڈیفنس کے ضوابط کی کتابوں میں (تمام چینی عوام کیلئے) اس پر زور دیا گیا کہ سنگینوں' چاقوؤں اور دستی بموں' کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے جنگ کی جائے' پیپلز آرمی کو رات کے اندھیروں' چھاپہ مار کارروائیوں' پہاڑوں اور جنگلوں میں لڑائی کی تربیت

دی گئی ہے۔ ان میں رواج ہے کہ میدان جنگ میں پیدل پہنچا جائے اور آبادیوں سے دور رہائش رکھی جائے' ہیرسن سالسبری نے روس اور چین کی متوقع جنگ کے بارے میں لکھا ہے کہ چونکہ چینیوں کو پہاڑیوں' غاروں اور خندقوں میں اس وقت تک پناہ حاصل کرنے کی تربیت دی جاتی ہے' جب تک دشمن دو سو میٹر کے فاصلے پر نہ آ جائے' اس طرح وہ ایک ایسے فاصلے سے جنگ میں شریک ہوتے ہیں جہاں ایٹمی ہتھیاروں' آواز سے تیز رفتار طیاروں اور تیز رفتار بکتربند گاڑیوں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

ہائیڈروجن بم کی ایجاد اور اس سے ملتے جلتے ایٹمی ہتھیاروں کی ترقی کے بعد دنیا بھر میں کئی غیر ایٹمی تصادم رونما ہو چکے ہیں' جن سے سر بیسل لڈل ہارٹ سمیت جنگی مفکروں کی پیشین گوئی کی تصدیق ہوئی ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی صورت میں چھاپہ مار جنگ جیسی کارروائیوں کو فروغ حاصل ہو گا' چھاپہ مار طور طریقوں اور تخریب کاری کو روایتی طریق جنگ کے ساتھ ملا کر جنوب مشرقی ایشیا' الجزائر' قبرص اور کیوبا وغیرہ میں کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ چونکہ حملہ کرنے اور دفاع کے سارے طریقے بڑے پیمانہ پر تبدیل ہو گئے ہیں' حملہ اور دفاع کی شکل جوں کی توں ہے' جنگ لڑنے کے طریقوں میں نت نئی تبدیلیاں ہوئی ہیں مگر وار گیم اب بھی انسانوں کے ہاتھ میں ہے اور طیاروں کے باوجود اس کا فیصلہ زمین پر ہوتا ہے' انسانی ذہانت اب بھی سب سے بڑی طاقت ہے۔

عظیم کارتھینین جرنیل ہنی بال (۲۰۰ ق م) کی زندگی کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے ہیرالڈ لیمب کا کہنا ہے:

"ہنی بال کی زندگی میں عصر حاضر کے انسان کیلئے بھی ایک انتباہ ہے' وہ یہ کہ جنگ میں تیکنیکی صلاحیتوں اور تباہی پھیلانے والے اسلحہ کے انبار کی ضرورت نہیں ہوتی' اپنے میکانکی عمل کے باوجود جنگ انسانوں اور ان کے اذہان سے ہم آہنگ ہوتی ہے' یہ ایک آرٹ ہونے سے کبھی بھی محروم نہیں ہوتی جس میں کوئی بہت بڑا آرٹسٹ الپس کے کسی درہ سے نکلتا ہے اور ہتھیاروں کی طاقت پر غالب آ جاتا ہے' چیزوں کے انبار لگا دینے سے ذہنوں کی برتری کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔"

جینئس حکم دینے سے وجود میں نہیں آتا مگر ذہنی برتری جنگ کے عمیق مطالعہ سے حاصل ہو سکتی ہے' اس لئے کہ اگر جنگ کو روکا نہیں جا سکتا' شکست سے تو بچا جا سکتا ہے اور موقع کو اپنے فائدے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے کیونکہ بھارت کی بظاہر طاقت حقیقت میں اس کی بہت سی کمزوریوں کے باعث کم ہو گئی ہے۔ بھارتی جارحیت کے بعد ہمارے

لئے ایسی جنگ عظیم تر حکمت عملی کے تحت سارے عوام کی مشترکہ جدوجہد کی شکل ہونی چاہئے' کیونکہ ہمارے لئے بنیادی اتحاد نسلی ہم آہنگی اور عقیدے کی ایکتا کے باعث اگر ہمیں فوجی اعتبار سے مغرب کی جانب واپس دھکیلا جائے گا تو یہ عمل سپرنگ کو دبانے کے مترادف ہو گا جو پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ اپنی جگہ پر واپس آئے گا۔ ہمارے دیہات کے دور دراز علاقوں میں ہمارے لوگوں کے عجز میں خوداعتمادی ہوتی ہے' وہ بھارت کی جانب پیش قدمی کیلئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں' اس جذبہ کی دوسری جانب کوئی مثال نہیں ملتی' ایسا جذبہ کئی نسلوں کے بعد کہیں جا کر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے سرحد کے قبائلی جن کی تعداد ۳۰۰٬۰۰۰ سے کم نہیں اور جو مسلح ہوتے ہیں' کئی صدیوں سے ہندوستان کو دل لبھانے والی شکار گاہ کے طور پر جانتے پہچانتے آ رہے ہیں۔ انہیں دشمن کی سرحدوں کے خلاف یلغار کیلئے بھیجا جا سکتا ہے۔ بھارت میں ہم آہنگی کے فقدان کے باعث کسی بھی سمت میں پیش قدمی جغرافیائی طور پر مختلف مخالف یونٹ علیحدہ کئے جا سکتے ہیں' کیونکہ شودروں' برہمنوں' سکھوں' ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی بنیادی اتحاد نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے اپنے اپنے مختلف مفادات ہیں۔ فی الوقت اور آنے والے طویل عرصہ تک بھارت اپنی اس حالت پر برقرار ہے جو صدیوں پہلے تھی اور جو ہنگامی حالات میں ٹکڑے ٹکڑے ہوتا رہا ہے۔ چین اور امریکہ جیسے بڑے ملکوں کی طرح جہاں قومیت کا وجود برقرار ہے' بھارت کی ان سے کوئی مماثلت نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔ بھارتی عوام ذات پات کے نظام' توہمات' مذہبی عدم رواداری' نسلی تعصبات' غربت' کم غذائیت اور پسپائی کی عادات میں جکڑے ہوئے ہیں' ماضی کا خوف اب تک ان پر آسیب کی طرح سوار ہے کیونکہ کئی دردناک حملے اس جانب سے اس پر ہوتے رہے ہیں اور ہم نے اس پر آٹھ صدیوں تک حکمرانی کی ہے۔ عوام کے ذہنوں سے اسے ایک شب میں محو نہیں کیا جا سکتا۔ ہتھیاروں کے معاملہ میں بھارت کی برتری کو ویت نام کے حوالہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ رقبہ کے اعتبار سے جنوبی اور شمالی ویت نام تقریباً ایک جتنے ہیں۔ (ہمارے پنجاب سے دونوں چھوٹے ہیں) مگر مادی وسائل کے لحاظ سے شمالی ویت نام کے پاس کمیونسٹ طاقتوں کی امداد سمیت جو کچھ تھا جنوبی ویت نام امریکہ کی حمایت سے خصوصی فضائی طاقت میں بہت برتری کا حامل تھا' اس کے باوجود آخرکار شمالی ویت نام جنوبی ویت نام پر چڑھ دوڑا اور اس کا صفایا کر دیا۔ ویت نام میں فضائی طاقت انڈین ایئرفورس کے مقابلہ میں ہوشربا تھی۔ (۱۹۷۵ء میں ۱۰۵ لڑاکا طیارے) اس کی حیثیت سمندر میں ایک قطرہ جیسی ہے۔ مئی ۱۹۷۲ء تک ویت نام میں امریکی فضائیہ

نے دوسری عالمی جنگ کے دوران جاپان اور جرمنی پر گرائے جانے والے بموں کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ بم گرائے تھے' جس سے ایک کروڑ گڑھے پیدا ہوئے' اس سے پائن اپیل کے نصف اور آدھے سے زیادہ جنگلات تباہ ہو گئے۔ بی باون طیاروں نے جو تیس ہزار فٹ کی بلندی پر نظر نہ آتے تھے اور آواز سے تیزرفتار ۵۰۰ پاؤنڈ کے جن بموں کی بارش کرتے' سرگوشی کی موت کہلاتے تھے۔ ان کے خلاف شمالی ویت نام میں کوئی وارننگ سسٹم بھی موجود نہیں تھا' امریکی فضائیہ شمالی ویت نام میں ہر دو ہفتوں کے دوران اس سے زیادہ بم گراتی تھی' جتنے پوری دوسری عالمی جنگ کے دوران برطانیہ پر گرائے گئے تھے۔ اس زبردست فضائی قوت کے باوجود شمالی ویت نام کے حملے کو روکا نہ جا سکا جو وقفہ وقفہ سے آگے ہی آگے بڑھتے رہے اور وہاں تک پہنچ گئے جہاں جدید ترین ہتھیار بے اثر ہو کر رہ گئے۔

ہمیں اپنے ذہن میں ویت نام کی مثال کو مستقل طور پر رکھنا چاہئے' دونوں فریقوں میں فرق قومی جذبہ اور حکمت عملی کا تھا۔

۱۹۷۲ء تک شمالی ویت نام میں عملی طور پر کوئی کارخانہ باقی نہ رہا' نہ کوئی صنعت تھی نہ خوراک' فوجی نقل و حمل کیلئے کسانوں اور سائیکلوں سے کام لینا پڑتا تھا' اب وہاں کوئی ایسی شے باقی نہیں رہی تھی جسے تباہ کیا جا سکتا' پھر بھی ان پر روزانہ چار سے پانچ ہزار ٹن بموں کی روزانہ بارش ہوتی تھی' اس کے باوجود لوگوں میں مثالی جذبہ تھا ایک عام فوجی ایک گھنٹہ میں بیس فٹ گہرا گڑھا کھود لیتا' اس طرح ایک آدمی کو ہلاک کرنے کیلئے ۷۳ ٹن یا کم و بیش پانچ سو پاؤنڈ والے ۳۰۰ بموں کی ضرورت تھی۔

جذبہ انسانی کو جب بروئے کار لایا جائے تو وہ ناقابل شکست ہوتا ہے اور پہل کاری و وسائل تلاش کرنے کی صلاحیت کے اعتبار سے انسانی ذہن کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ قتل عام' تباہی اور بمباری جن پر کئی جرنیل عام طور پر اتر آتے ہیں' کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی' جرنیلی کا تقاضہ ہوتا ہے کہ سوچ بچار سے کام لیا جائے اور عددی برتری اور ہتھیاروں کی طاقت ہی سب کچھ نہیں ہوتی' نپولین نے جس پر ڈھائی لاکھ سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں' کہا تھا

"جنگ لڑنے کا آرٹ یہ ہے کہ کم تر فوج کو طاقت کے اعتبار سے اس مقام پر لایا جائے جہاں وہ حملہ کرتی ہے یا اس پر حملہ کیا جاتا ہے" اپنے کیریئر کے تیئس برسوں میں اس نے ساٹھ جنگیں لڑیں جن میں سے ہر جنگ کو کلاسیک کا درجہ حاصل ہے' مدمقابل کے

مقابلہ میں نپولین کو کبھی بھی فوج اور اسلحہ کے اعتبار سے برابری حاصل نہ تھی، حکمت عملی وضع کرنے میں اس کی کوئی مثال نہ تھی' وہ سمجھتا تھا کہ جنگ کا فیصلہ ایک لمحہ میں ہوتا ہے جس طرح کوئی ایک قطرہ برتن کو لبالب بھر دیتا ہے' اس کی جنگ بازی کی کوئی حد نہ تھی' وہ اپنی طاقت اور ارادوں کو مخفی رکھنے کا ماہر تھا' منصوبہ بندی اور کئی ماہ پیشگی سوچ بچار سے وہ مکمل احتیاط کے ساتھ نتائج وضع کرتا اور بدترین صورتحال کے حوالہ سے ہمیشہ ایک متبادل منصوبہ بھی تیار رکھتا' اس کے خیال میں وقت کے ضیاع کا کوئی بدل نہ تھا وہ راستوں اور مقاصد کا انتخاب کر کے کئی گھنٹے اور دن ضائع ہونے سے بچا لیتا تھا' اس کا تیز رفتاری پر انحصار ہوتا تھا' وہ دشمن پر اچانک ٹوٹ پڑتا' یہ ایک ایسی بات تھی جس سے اس کے مقابلہ پر آنے والوں کی اکثریت کے اوسان خطا ہو جاتے' کام کرنے کی استعداد اس میں بے پایاں تھی' وہ نہ صرف اپنی سوچ میں پہل کاری کرتا بلکہ اپنے کام کی جزیات کا بھی خود ہی تعین کرتا تھا۔ او کیٹو اے برائی کے مطابق "ہر دور کی شخصیتوں میں سے نپولین عظیم تر تھا' فیصلہ کرنے کی رفتار' غیر متزلزل عزم اور حقیقت شناسی میں اس کا کوئی جوڑ نہ تھا' میدان جنگ میں وہ بے مثال جرات' حاضر دماغی اور تحمل سے کام لیتا' اس کی طرح سے گہری سوچ اور فوری فیصلہ کرنے کی صلاحیت کا حامل کم ہی کوئی ملے گا۔ اس کے مقابلہ میں فوجیں اور ہتھیار لامحدود تھے۔ برٹش ایمپائر کے سارے وسائل اس کے مقابلہ پر تھے' سارے سمندروں اور یورپ کی ساری حکومتوں کے وسائل اور لندن کے تاجروں کی پوری یورپی مارکیٹ پر اجارہ داری کی ہوس کا اس نے تن تنہا مقابلہ کیا' فرانس کے خلاف اس کی جدوجہد کے دوران اس کا سرمایہ یہی تھا کہ جرنیل کی حیثیت سے اس نے خوف و ہراس نہیں بلکہ شکوہ سے کام لیا' نپولین ہمیشہ ایک سپاہی' جینئس اور جدید یورپ کے خالق کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔

لہٰذا اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ جنگ میں سب سے بڑا ہتھیار ذہن ہوتا ہے۔ کسی قوم کے ذہن کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ کمانڈر کا ذہن اس کی مختلف خوبیوں سے عیاں ہوتا ہے' جن کی مدد سے وہ غیر معمولی نتائج حاصل کرتا ہے اور اس نوع کے معاملات میں حاصل ہونے والی کامیابیوں کے طریقے صاف ظاہر ہوتے ہیں جن کا مطالعہ کر کے انہیں سمجھا جا سکتا ہے۔

۶۳۶ء کے موسم بہار میں خالد بن ولید کی پوری قوت ۲۴۰۰۰ پر مشتمل تھی' ہیراکلیوس نے ان کے مقابلہ میں ۵۰،۰۰۰ افراد پر مشتمل نئی فوج بھیجی' جن کی تربیت اور

ہتھیار ان سے بہتر تھے۔ خالد نہ تو مایوس تھے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے اور نہ شیخی بگھارتے تھے کہ وہ مقدس سرزمین کے چپہ چپہ کی حفاظت کریں گے' فی الحقیقت وہ صحیح طرح کے کمانڈر تھے اور داؤ پیچ جانتے تھے' عددی کمی کی کسر پوری کرنے کی غرض سے وہ چاہتے تھے کہ بہتر میدان کا انتخاب کریں' لہٰذا انہوں نے ایک لمحہ کا بھی توقف نہ کیا اور دمشق سے دستبردار ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ مگر دشمن کو اپنی طرف کھینچتے رہے' حتیٰ کہ انہوں نے اپنی فوجوں کو وادی یرموک کے جنوب مشرق میں تعینات کر دیا' جہاں انہوں نے دشمن کے مواصلاتی رابطہ کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اس جنگ کا نتیجہ محض مکمل شکست نہیں بلکہ دشمن کا مکمل صفایا تھا۔ تاریخ میں یہ فیصلہ کن جنگ کی حیثیت سے یاد رکھی جائے گی۔ مورخین اس پر متفق ہیں کہ طارق بن زیادہ ۷۱۱ء میں جبل الطارق کے مقام پر صرف ۷۰۰۰ آدمیوں کے ساتھ ساحل سپین پر اترے تھے۔ میدان جنگ میں ان کی قوت معمولی تھی' مگر اس کے پیچھے کیا تھا؟ شمالی افریقہ کے گورنر موسیٰ کی مکمل حمایت!

بعض مغربی مصنفین کے مطابق دمشق میں متمکن خلیفہ نے سمندر پار محدود فوج لے جانے دی تھی' جو کچھ بھی تھا' حقیقت یہی تھی کہ انہوں نے موسیٰ کا انتظار بھی نہ کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے نزدیک سرعت کے ساتھ وہاں پہنچنے کی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔ انہوں نے صرف پہاڑیوں پر مورچہ بندی کیلئے کچھ دیر توقف کیا اور اسے اپنا مرکز بنایا اور کنگ روڈرک کے مقابلہ کی غرض سے سلادو وادی کی جانب سے ساحل کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کی' راستے میں طارق نے ۵۰۰۰ سے زیادہ کمک حاصل نہیں کی' اس طرح ان کی قوت زیادہ سے زیادہ صرف ۱۲۰۰۰ افراد پر مشتمل تھی۔ جبکہ ان کے مقابلہ میں روڈرک کی فوجوں کی تعداد ۱۰۰۰۰۰ تھی۔ روڈرک کے بعض سربراہ سابقہ رنجشوں کی بنیاد پر اسے چھوڑ کر چلے گئے ہوں گے' اس کے باوجود شاہی فوج کو بہتر اسلحہ' نظم و ضبط کے اعتبار سے برتری حاصل تھی اور وہ طارق کی فوج کے مقابلہ میں پانچ گنا زیادہ تھی۔

مسلمان اور مغربی مورخ اس پر متفق ہیں کہ جنگ کے نتیجہ میں روڈرک کی ساری فوج کا صفایا ہو گیا اور ۱۹ جولائی کو روڈرک ڈوب مرا۔

۳۳۱ ق م میں اربیلا کے مقام پر سکندر نے دارا کو شکست فاش دی' میدان جنگ میں نہ تو اس کی فوج کا اس کی فوجی طاقت سے کوئی مقابلہ تھا اور نہ ہی ایرانیوں کے مقابلہ میں اسے کوئی اور برتری حاصل تھی' نہ ہی ایرانیوں کی تربیت' ہتھیاروں اور جرات کے معاملہ میں کوئی کمی تھی' اس کے باوجود یونانیوں کی فتح اتنی مکمل تھی کہ ۹۰۰۰۰ ایرانی مارے گئے'

میدان جنگ میں ایرانی فوج ۳۰۰،۰۰۰ انفنٹری اور ۴۰۰۰۰ کیولری پر مشتمل تھی۔ اس کے ساتھ اس کے پاس نیزہ بردار ہاتھی اور رتھ بھی تھے جو بے تحاشا قتل عام کرتے بازو، ٹانگیں اور سر قلم کرتے جاتے تھے۔ ساری زمین کو ہموار کر کے اور محاذ پر ساری رکاوٹیں ہٹا کر وسیع رقبہ کو رتھوں کیلئے خصوصاً اور جنگ کیلئے عموماً پہلے ہی تیار کر لیا گیا تھا۔ اس کے مقابلہ میں سکندر کے ساتھ صرف ۴۰۰۰۰ انفنٹری اور ۷۰۰۰ کیولری تھی، ان کے مقابلہ میں ایرانیوں نے جیسے دیوار کھڑی کر رکھی تھی، مگر سکندر کی سوچ مختلف تھی، جو کچھ ہوا اسے مختصراً یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔ ان مورخین سے معذرت کے ساتھ جنہوں نے انتہائی سہل پسندی سے کام لیا ہے۔

اپنی فوج کے چار روز تک آرام کرنے کے بعد اس نے ایرانیوں کی جانب تین میل اندر پیش قدمی کی، دشمن کی صفوں، مورچہ بندی اور پورے میدان جنگ کا جائزہ لیا۔ سکندر نے ایرانیوں کے قلب کے سامنے جہاں دارا تھا، اپنی فوجوں کو جمع کیا، اس نے اپنے تیز رفتار دستے اس طرح ترتیب دیئے کہ وہ تمام اطراف سے سامنا کر سکتے تھے، اس نے رات کو حملہ کرنے کا خیال مسترد کر دیا، اس کے بجائے اس نے فیصلہ کن حملہ کی تدبیر کی جس کیلئے روز روشن کی ضرورت تھی، اب اس نے پیش قدمی کا آغاز کرتے ہوئے اس نے قلب کا براہ راست رخ نہ کیا۔ بلکہ ایرانیوں کے بائیں جانب کے زاویئے سے اسے شروع کیا، یہ دیکھ کر دارا نے اس کے ساتھ متوازی پیش قدمی کی اور اپنی کیولری کو حملہ کیلئے بھیجا، کئی حملے اور جوابی حملے ہوئے مگر سکندر نے اپنی چال جاری رکھی حتیٰ کہ یوں لگا جیسے وہ میدان کے آخری سرے کی جانب جا رہا ہے، جسے خاص طور پر ہموار کیا گیا تھا۔ دارا نے یہ جان کر کہ اس کے رتھ اب ناقابل استعمال ہو جائیں گے، انہیں سکندر کی جانب بھیجا، تاکہ بھگدڑ مچا دی جائے، مگر اس صورتحال کے پیش نظر سکندر نے نیزوں اور تیروں کی بارش کر دی تاہم جب ایرانیوں نے مزید طاقت مجتمع کر کے اسے روکنے کی غرض سے اس کے دائیں جانب رخ کیا، سکندر نے سوچا اب وہ گھڑی آ گئی ہے جس کے لئے اس نے منصوبہ بندی کر رکھی تھی، اب اس نے خود کو اپنی کیولری کے سامنے رکھتے ہوئے چکر لگایا اور ایرانیوں کے قلب میں پیدا ہو جانے والے شگاف پر ضرب لگائی جو ان کی اپنی کیولری نے پیدا کر دیا تھا، یہاں سے وہ اہم مقام پر جہاں دارا تھا، پہنچ گیا۔ اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا، اس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، سکندر نے دشمن کے رد عمل کا صحیح اندازہ لگایا تھا اور یہی سکندر کی دور اندیشی تھی، جسے مورخین اس کی فتح کی وجہ گردانتے ہیں، ۳۲۶ ق م میں کنائی

باب ۱۸

قبائل

اس کتاب کے اختتام سے قبل یہ ضروری ہو گا کہ قبائل کے سلسلے میں کچھ وضاحتیں اور معلومات قارئین کے سامنے لائی جائیں' اس امر پر بحث کہ قبائل کو وہاں جانا چاہئے تھا یا نہیں جانا چاہئے تھا' میرے موضوع سے خارج ہے اور یہ بھی کہ اگر چند ناخوشگوار واقعات وقوع پذیر ہوئے تو اس کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے بلکہ میں تو صرف اس حقیقت پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ قبائلیوں کی وہاں موجودگی مجموعی طور پر ہمارے مقصد کے لئے انتہائی مفید رہی' ان کی قوت کا ہر پہلو ہمارے لئے معاونت کا سامان فراہم کرتا' نیز یہ بھی کہ کشمیر میں کشمیری مسلمانوں کی جنگ آزادی میں ان کی مدد کرنا کس کی ذمہ داری تھی اور جہاں تک قبائل کا تعلق ہے' وہ آج بھی پاکستان کے لئے بہت بڑی اور موثر دفاعی قوت ہیں۔

قبائلیوں کی موجودگی کی اہمیت پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے اس قبائلی علاقے اور وہاں کے عوام کی فاخرانہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور ان خدمات کو دہرایا جائے جو انہوں نے پاکستان کے لئے سرانجام دی ہیں۔

دریائے سندھ اور ڈیورنڈ لائن کے مابین قبائل کی یہ پٹی جس پر سرحد کے یہ بہادر جنگجو آباد ہیں' صدیوں بلکہ ہزاروں سال سے بیرونی حملہ آوروں کی گذرگاہ رہی ہے' جسے ہندوستان پر حملہ کرنے والے ہر جرنیل نے بطور داخلی راستہ کے اختیار کیا اور ان کے نقش قدم آج بھی اس علاقے میں دیکھے جا سکتے ہیں اور انہی حملہ آوروں کی باقیات خصوصی طور پر وسط ایشیائی حکمرانوں کی نسل کے لوگ اس پٹی کو آباد کئے ہوئے ہیں' حالانکہ یہ علاقہ کسی قسم کی پیداوار کے لئے معروف بھی نہیں۔

یہی وہ راستہ ہے جس پر چار ہزار سال قبل دریائے آمور کو عبور کر کے آریا لوگ اسی راستہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے جہاں انہوں نے وہاں کے قدیم باشندوں دراوڑوں کو جنوب کی طرف دھکیل دیا اور خود اس علاقے میں آباد ہو گئے۔

صدیوں بعد جب سکندر اور ایرانی شہنشاہ نوشیروان ایک دوسرے کے سامنے صف آراء ہوئے تو نوشیروان کی فوجوں میں اس علاقے سے تعلق رکھنے والے موجود تھے۔ یونانی مورخ ہیروڈوٹس کی فوج میں اس علاقے سے تعلق رکھنے والے قبائلیوں کا دستہ لمبے چوغے اور کھالوں کا لباس پہنے تیر کمان اور خنجروں سے مسلح تھے۔ آج بھی خنجر قبائلیوں کا ایک اہم ہتھیار ہے۔

۳۲۷ ق م میں جب سکندر اعظم ایران کو فتح کرنے کے بعد ہندوستان جاتے ہوئے اس علاقے سے گزرا تو اس علاقے کے جنگجو قبائل نے سکندر کو کافی پریشان کیا' بقول ہیروڈوٹس اس امر کا امکان ہے کہ یہ لوگ انہی دستوں کا حصہ رہے ہوں' جنہوں نے (۳۳۱ ق م) گوجی میلا کے مقام پر ایرانی فوجوں کی معیت میں جنگ لڑی ہو' ہیروڈوٹس کے زمانے ہی سے آفریدی اور دیگر قبائل انہی جگہوں پر آباد ہیں جہاں وہ پہلے تھے۔

سکندر کی واپسی کے بعد ہندوستان کے شہنشاہ چندر گپت موریا نے اس علاقے کو اپنی قلم رو میں شامل کر لیا' مگر سکندر کے ساتھ آنے والے کئی دستے یہیں پر رہ گئے۔ موریا عہد کے دوران بدھ مت کو خاصی قبولیت ہوئی اور کچھ سال بعد مزید یونانی باختری قبائل ایران کی طرف سے وارد ہوئے اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ ان کی حکومت کو بعد میں آنے والے ایرانی النسل قبائل نے فتح کیا' جو ان کی آمد کے ساتھ ہی اس علاقے میں موجودہ پشتو زبان کی ابتدا ہوئی' پشتو زبان انڈو آرین گروپ کی قدیم ایرانی اور ساکا لہجہ کا امتزاج ہے' ساکیوں کے بعد ایک اور گروہ آیا مگر انہیں بھی بعد میں آنے والے کشانوں کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی۔ کشان آتش پرست تھے' مگر ان کے بادشاہ کنشک نے بدھ مت کو قبول کر لیا اور اس طرح یہ سب لوگ بدھ مت کے پیروکار بن گئے' انہوں نے پشاور کو اپنا صدر مقام بنایا اور بدھ مت کی تبلیغ کے لئے بہت سی خانقاہیں قائم کیں' انہوں نے اپنی تجارت کے فروغ کے لئے مشرق میں چین اور مغرب میں یورپ تک تجارتی گزرگاہیں بنائیں' انہی کے دور میں گندھارا فن کو فروغ حاصل ہوا۔

در اندازوں کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا کشان کے بعد ساسانی حتیٰ کہ سفید ھن وارد ہوئے اور یہاں کی آبادی میں خلط ملط ہو گئے' یہ پانچویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے' یہ ھن اپنے لیڈر کو خان کہتے تھے تب سے یہ لفظ اس علاقے میں کثرت سے استعمال ہونے لگا۔

۱۰۰۰ء میں افغانستان کا ایک حکمران محمود ہندوستان پر حملوں کے دوران ادھر آنا شروع ہوا تو اس علاقے کے لوگوں نے اسلام قبول کیا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں

مسلمانوں اور پٹھانوں کے پھیلنے کا عمل شروع ہوا۔

۱۲۲۱ء میں چنگیز خان ۱۳۸۰ء میں فرغانوں کے تیمور لنگ اس علاقے میں وارد ہوئے۔ ۱۴۵۰ء میں لودھی ہندوستان میں داخل ہوئے جہاں وہ تین سو سال سے زائد بطور سپاہی، منتظم حتیٰ کہ بادشاہ بھی رہے مگر ان کے آبائی وطن میں قبائل کی صورتحال بدستور وہی تھی، حالانکہ یہ سارا علاقہ ہندوستانی شہنشاہ کی سلطنت کا حصہ بنا۔ پشاور میں متعین گورنر شہنشاہ کا نمائندہ تھا، مگر قبائلی برائے نام ہی دہلی کے ماتحت ہوتے تھے۔

۱۵۲۰ء میں بابر جو کہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی تھا، ہندوستان میں داخل ہونے سے پہلے کئی سال اس قبائلی علاقے میں اپنی مہم کی تیاری کرتا رہا، تاکہ ہندوستان میں داخل ہونے سے پہلے اپنا فوجی مستقر قائم کر سکے۔ تقریباً پچاس سال بعد ۱۵۸۶ء، ۱۵۸۷ء میں بابر کا پوتا شہنشاہ اکبر اعظم اس علاقے میں آیا جہاں دو بغاوتیں اسے کھینچ لائی تھیں، جن میں سے ایک بغاوت سوات اور بونیر میں تھیں، جس میں اکبر کے ۸ ہزار سپاہی اور اس کا وزیر بیربل جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، دوسری بغاوت خیبر کے علاقے میں تھی اور یہاں بھی آفریدی اور مہمند قبائل نے اکبری فوج کو پیچھے دھکیل دیا۔

۱۶۲۰ء کے لگ بھگ جب جہانگیر کے کابل میں تعینات گورنر مہابت خان نے آوڑک زئی قبائل کے تین سو سرداروں کو دعوت پر بلایا اور انہیں بعد میں اذیت ناک سزائیں دے کر ہلاک کر دیا اور مغل کمانڈر غیرت خان، اوڑک زیوں کے علاقے تیرا کی طرف بڑھا تو اوڑک زیوں نے نہ صرف غیرت خان کو قتل کر دیا بلکہ مغل فوجوں کو شکست بھی دے دی۔

سات سال بعد ۱۶۲۷ء میں قبائل کے گورنر مظفر خان نے جب احرار خان کو قتل کروایا تو آفریدی اور اوڑک زئیوں نے احراد خان کی بیوہ کی قیادت میں قبائل پر حملہ کر دیا، جس میں مظفر خان تو فرار ہو گیا مگر اس کی بیوی قبائلیوں کے ہاتھ لگ گئی۔

پچپن سال بعد یعنی ۱۶۷۲ء میں اورنگزیب کے ایک گورنر نے جو پشاور میں متعین تھا ایک مہم شروع کی جسے خیبر کے علاقہ میں قبائلیوں کو سزا دینا مقصود تھا کیونکہ ان قبائل نے مغلوں کے خلاف بغاوت کی تھی۔ محمد امین جب فوجیں لے کر اس علاقے میں داخل ہوا تو ان قبائل نے ان کو چاروں طرف سے گھیر کر ان کا قتل عام کیا۔ اس مہم میں ہر چیز یعنی فوجی، گھوڑے، ہاتھی حتیٰ کہ محمد امین کی بیوی اور ماں بھی محفوظ نہ رہ سکی۔

دو ہی سال بعد مغلوں کو ایک اور صدمے سے دوچار ہونا پڑا جب نوشہرہ کے قلعہ کو

خوشحال خان خٹک اور عابل آفریدی نے فتح کر لیا اور سرکاری فوجوں کا ٹکراؤ آفریدیوں سے ہوا' وہاں بھی مغل فوجوں کو مہمندوں کا سامنا کرنا پڑا۔

مزید پچاس سال بعد ۱۸۲۳ء میں جب درانی اس علاقے پر حکمران تھے تو یہ دور انتہائی ابتری کا تھا کیونکہ درانی حکمران آپس میں ہی ایک دوسرے کی سرکوبی میں لگے ہوئے تھے' کبھی کابل' کبھی پشاور' کبھی قندھار اور سرحد کا علاقہ تذبذب کے عالم میں تھا کہ رنجیت سنگھ نے دریائے سندھ عبور کر کے اٹک کے قریب نوشہرہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا' کیونکہ سکھوں کی فوج انتہائی تربیت یافتہ تھی اور پٹھان افراتفری کے عالم میں لائے گئے تھے اور اعظم خاں بروقت نہ پہنچ سکا۔ سکھوں نے وادی پشاور کو تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا۔ پشاور شہر کو بھی زبردست نقصان پہنچایا۔ اس کے باوجود سکھ کبھی بھی اس علاقے کو مکمل طور پر اپنے قابو میں نہ رکھ سکے۔ ۱۸۳۷ء میں ہری سنگھ نلوا پشاور میں سکھ گورنر کو ایک کارروائی کے دوران ہلاک کر دیا گیا' حتیٰ کہ ۱۸۳۶ء میں انگریز پشاور پہنچ گئے۔

۱۸۴۹ء سے ۱۹۴۷ء تک انگریزوں نے اس علاقے میں درسگاہیں' ہسپتال اور سڑکوں کے جال بچھائے' حالانکہ یہ اس کا زمانہ نہیں تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انگریزوں نے علاقے میں انتظامی اداروں کو بھی مستحکم کیا۔

۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۱ء تک ۲۴ سال کے عرصے تک انگریزوں نے قبائلی علاقے میں تقریباً فوجی مہم بھیجنا پڑیں۔ ۱۸۶۳ء میں انگریزوں نے چھ ہزار کی ایک فوج بونیر کی طرف روانہ کی یہ وہی مقام ہے جہاں اکبر کو شکست دی گئی تھی' چھ ہزار پر مشتمل یہ انگریزی دستہ قبائلیوں نے تہہ تیغ کر دیا۔

درے پر قبضہ کے لئے چھ ہزار ہفتے تک لڑائی جاری رہی' تاہم بعد میں ایک صلح نامہ تیار کیا گیا مگر انگریزوں کو اس کی ایک شق پر اعتراض تھا' اس طرح تیس سال تک انگریز بونیر اور سوات میں داخل نہ ہو سکے۔

۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۵ء تک قرم اور مالاکنڈ کے علاقوں میں بھی انگریزوں کو تین مرتبہ فوج کشی کرنی پڑی۔ ۹۸-۱۸۹۷ء کے دوران انگریزی فوجوں نے وسیع پیمانے پر بونیر' سوات اور مہمند قبائل کے علاقوں پر فوج کشی کی۔ اس سے قبل اتنی بھاری تعداد میں انگریزی فوج استعمال نہیں کی گئی تھی۔

جہاں تک وزیرستان کا تعلق ہے وہاں کے ریکارڈ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ یہ علاقہ کبھی بھی کسی بیرونی طاقت کا محکوم نہیں رہا۔ غالباً انگریز

واحد بیرونی حکمران تھے جنہوں نے قبائلی علاقہ میں سڑکوں کے علاوہ قلعے اور حفاظتی چوکیاں بنائیں، مگر کسی قسم کے ٹیکس کا نفاذ یہ بھی نہ کر سکے۔

وزیرستان کے علاقہ میں وسیع پیمانے پر لشکر کشی انگریزوں نے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ء کے دوران کی اور اس بار بھی وزیری قبائل نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ہر بیرونی حملہ آور کے لئے یکساں طور پر مزاحم، دلیر اور جنگجو ہیں اس جنگ میں جو پانچ روز جاری رہی۔ محسودی قبائل نے دشمن کا مقابلہ نہ صرف جدید اسلحہ سے کیا بلکہ اپنے روایتی ہتھیار تلوار اور خنجروں کے بھی خوب خوب جوہر دکھائے۔ انگریزوں کے جانی نقصان کا تخمینہ دو ہزار سے زائد تھا جبکہ ان میں تیس افسر بھی شامل تھے۔ قبائلیوں کا جانی نقصان بلاشبہ دگنا رہا ہو گا مگر ان کے نزدیک اصل کامیابی یہ تھی کہ انہوں نے اپنی آزادی پر آنچ نہ آنے دی۔

۱۹۳۵ء میں مہمند قبائل اور ۴۰-۱۹۳۷ء میں دوبارہ وزیرستان پر قبضہ کرنے کے لئے انگریزوں نے سر توڑ کوشش کی اس طرح قیام پاکستان تک یعنی ۱۹۴۷ء تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، کبھی ایک جگہ یہ قبائل انگریزوں کا تسلط قبول کرنے پر کسی صورت تیار نہ تھے کیونکہ ان کے نزدیک آزادی دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے جس کے لئے جان کا نذرانہ بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ ہے ان قبائل کی وہ خصوصیت جو انہیں دیگر خطوں کے لوگوں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ تھی ان قبائل کی وہ خصوصیات جو انہیں کشمیر میں بھارتی تسلط کے خلاف کشمیریوں کی جنگ آزادی میں شریک ہونے کے لئے کھینچ کر لے گئی ان کا مقابلہ ایک ایسی باقاعدہ فوج سے تھا جو جدید ہتھیاروں، توپ خانوں اور ایئرفورس بھی رکھتی تھی جبکہ یہ قبائلی ایک رائفل وہ بھی مقامی طور پر تیار کردہ اور ایک خنجر سے مسلح ہو کر دشمن کے انجانے علاقے میں اپنے وطن سے سینکڑوں میل دور لڑنے گئے یہ صرف انہی قبائلیوں کا کام ہے، دوسرا کوئی شخص ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔

ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو محاذ جنگ پر ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور لاتعداد وہ تھے جو زخمی ہو کر وطن واپس لوٹے ان کی یادگار میں کوئی مینار نہیں تعمیر کیا گیا مگر پاکستانی تاریخ کا ابتدائی باب ان کے ذکر ہی سے شروع ہوتا ہے اور ان کے اپنے وطن میں بھی ان کا نام ہمیشہ عزت و احترام کی نگاہ سے یاد رکھا جائے گا۔

اتنے برس گزر جانے کے بعد اب اس سوال کا جواب تلاش کرنا چنداں مشکل نہیں ہے۔

جنرل اکبر خان کی یہ کتاب ان کی زندگی میں ہی اشاعت کے لئے تیار ہو گئی تھی اس میں انہوں نے جدید حربی حکمت عملی کے حوالہ سے کئی اضافے بھی کئے تھے مگر اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے پہلے ہی وہ کراچی میں طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے ان کا یہ سوال آنے والے کئی برسوں تک اپنی صداقت کی گواہی دیتا رہے گا۔

"کشمیر کی آزادی کے لئے صحیح سمت میں ایک قدم نہ اٹھا کر ہمارے لیڈر خوف تلے دبے رہے ہیں۔ خوف کے باعث انہوں نے ہماری انمول آزادی کو دولت، آسائشوں اور اسلحہ کے حصول کے لئے بیچ دیا، اس کے عوض انہوں نے اتنے قرضے حاصل کئے کہ اب انہیں واپس کرنا ہمارے بس میں نہیں رہا، نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے ملک میں بے رحمی کے ساتھ استحصال کرنے والے صنعتی لٹیرے پیدا ہو گئے جس کے نتیجہ میں پاکستان اور بھارت کے مابین معمول کی تجارت اور آمدورفت بند ہو گئی اور ہماری قومی زندگی کے تاروپود میں غیر ملکی ایجنٹ در آئے اور مداخلت کاری کرنے لگے۔ ہمارا ہر فیصلہ حکومت کی ہر تبدیلی اور ہر سیاسی، اقتصادی اور سماجی معاملہ غیر ملکی سازشوں کا مرہون منت ہو کر رہ گیا۔ ہم نے کشمیر کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کو جرات کے ساتھ نہیں نبھایا۔ وہ لوگ حقیقی معنی میں کبھی آزاد نہیں ہوتے جو اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے خطرات کا پامردی سے مقابلہ نہیں کرتے، ہمارے لیڈروں پر ابتدا ہی سے خوف کا غلبہ رہا ہے"۔

رحمت شاہ آفریدی

نہرو ہمیں چھاپہ مار کہتے تھے' اس سے ان کا مقصد ہماری تحقیر تھا مگر جو بات ان کے علم میں نہیں تھی' یہ ہے کہ آج کل جنگ کے فن کے اس انتہائی شعبہ کو انتہائی ترقی یافتہ سمجھا اور قبول کیا جاتا ہے' طیارے' چھاپہ مار' کمانڈو' ٹینک اور آرٹلری گروپ' آبدوزیں حتیٰ کہ چوغہ پوش خنجروں والی روایت کو بھی 'حملہ کرو اور چھپ جاؤ' کے طریق کار کو جنگ کے دوران مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی توہین کے بغیر ہم چھاپہ ماروں کا نام جہاں تک صوبہ سرحد کے جنگجوؤں کا تعلق ہے قبول کر سکتے ہیں' فوجی اعتبار سے وہ انتہائی قابل اور دلیر چھاپہ مار ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس طرح ہمارا شمار چنگیز خان' تیمور لنگ' محمود غزنی حتیٰ کہ سکندر جیسی نامور شخصیتوں میں ہوتا ہے انہیں بعض مورخین نے چھاپہ مار کا نام دیا ہے۔

یہ کتاب' ذاتی بیان کے حوالہ سے قارئین کو جنگ کے متعلق اور مسئلہ کے بارے میں مجموعی صورتحال سے آگاہ کرے گی۔

اکبر خان